عمیرہ احمد

آبِ حیات

آب حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کردیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایئر رنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں، جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کررہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سراغ مل جاتا ہے۔

J۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال
کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔
6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ نینسی
نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست
اسپیلنگ بتا دیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ
سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد، مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی، جسے دیکھ
کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے، مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔
A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کر دی اور ترمیم شدہ باب
کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔
7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کر دیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی
نے پھر ڈانس کی آفر کی، اس نے اس بار بھی انکار کر دیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے
کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔
4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور
کر دیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔
5۔ وہ جیسے ہی گھر آیا۔ معمول کے مطابق اس کے دونوں بچے اپنا کھیل چھوڑ کر اس کے گلے آلگے۔ حسب معمول اس
کی بیوی نے بھی جو تیسری بار امید سے تھی، اس کا پرتپاک استقبال کیا۔ وہ لان میں اپنی بیوی بچوں کو مطمئن و مسرور دیکھ کر
سوچ رہا ہے کہ اگر وہ چند پیپر پھاڑ کر پھینک دے تو اس کی زندگی آئندہ بھی اسی طرح خوب صورت رہ سکتی ہے۔ مگر وہ

ضروری فون آجاتا ہے۔ جس کا وہ انتظار کررہا ہے۔ اب اسے اپنی فیملی اور استعفیٰ میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا تھا۔

8۔ پریذیڈنٹ ایک انتہائی مشکل صورت حال سے دوچار تھا۔ اس کا فیصلہ کانگریس کے الیکشنز پر بری طرح اثر انداز ہو سکتا تھا۔ کیبنٹ کے چھ ممبرز کے ساتھ پانچ گھنٹے کی طویل نشست کے بعد اسے پندرہ منٹ کا وقفہ لینا پڑا تھا۔ فیصلے کی ذمہ داری اس کے سر تھی۔ آخر کار وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

10۔ الزائمر کے مریض باپ کو وہ اپنے ہاتھوں سے یخنی پلا رہا تھا۔ اس کے انداز میں اپنے باپ کے لیے نہایت پیار، احترام اور تحمل ہے۔ اس کے باپ کو معلوم نہیں کہ وہ اس کے ہاتھ سے آخری بار کھانا کھا رہا ہے۔ اس کا سامان ایئرپورٹ پر جاچکا ہے اور وہ گاڑی کا انتظار کررہا ہے۔

Q۔ وہ نیلے رنگ کی شفاف جھیل پر اس کے ہمراہ ہے۔ خوب صورت حسین مناظر میں گھری جھیل میں وہ صندل کی لکڑی کی کشتی میں سوار ہے۔

K۔ وہ تیسری منزل پر بنے اپارٹمنٹ کے بیڈ روم کی کھڑکی سے ٹیلی اسکوپ کی مدد سے ساٹھ فٹ کے فاصلے پر اس بینکوئٹ ہال پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ ٹائم نو بج کر دو منٹ ہو رہے ہیں۔ پندرہ منٹ بعد وہ مہمان بینکوئٹ ہال میں داخل ہوگا۔ وہ ایک پروفیشنل شوٹر ہے۔ اسے مہمان کو نشانہ بنانے کے لیے ہائر کیا گیا ہے۔

3۔ وہ اس سے اصرار کررہی ہے کہ نجومی کو ہاتھ دکھایا جائے۔ وہ مسلسل انکار کرتا ہے مگر اس کی خوشی کی خاطر مان لیتا ہے نجومی لڑکی کا ہاتھ دیکھ کر بتاتا ہے کہ اس کے ہاتھ پر شادی کی دو لکیریں ہیں۔ دوسری لکیر مضبوط اور خوشگوار شادی کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ دونوں ساکت رہ جاتے ہیں۔

آدم و حوا

ایک خوب صورت اتفاق نے سالار اور امامہ کو یکجا کردیا۔ اس نے امامہ کو سال بعد دیکھا تھا۔ ان کی ابتدائی زندگی کا پہلا اختلاف لائٹ پر ہوا۔ سالار کو لائٹ آن کرکے سونے کی عادت تھی جبکہ امامہ کو روشنی میں نیند نہیں آتی تھی۔ لیکن سالار نے امامہ کی بات مان لی۔ صبح وہ امامہ کو جگائے بغیر سحری کرکے نماز پڑھنے چلا جاتا ہے، امامہ سحری کے لیے اٹھتی ہے تو فرقان کے گھر سے کھانا آیا رکھا ہوتا ہے۔ امامہ اسے سالار کی بے اعتنائی سمجھتی ہے۔ سعیدہ اماں سے فون پر بات کرتے ہوئے وہ رو پڑتی ہے اور وجہ پوچھنے پر اس کے منہ سے نکل جاتا ہے کہ سالار کا رویہ اس کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے۔ سعیدہ اماں کو سالار پر سخت غصہ آتا ہے۔ وہ ڈاکٹر سبط علی کو بھی بتادیتی ہیں کہ سالار نے امامہ کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔

سالار ڈاکٹر سبط علی کے گھر امامہ کا روکھا رویہ محسوس کرتا ہے، سعیدہ اماں بھی سالار کے ساتھ ناراضی سے پیش آتی ہیں۔ پھر امامہ اس رات سعیدہ اماں کے ہی گھر رہ جاتی ہے۔ سالار کو اچھا نہیں لگتا مگر وہ منع نہیں کرتا۔ امامہ کو یہ بھی برا لگتا ہے کہ اس نے ساتھ چلنے پر اصرار نہیں کیا۔ اس کو سالار سے یہ بھی شکوہ ہوتا ہے کہ اس نے اسے منہ دکھائی نہیں دی۔

سالار اپنے باپ سکندر عثمان کو بتادیتا ہے کہ اس کی شادی آمنہ نامی جس لڑکی سے ہوئی ہے وہ دراصل امامہ ہے۔ سکندر عثمان اور طیبہ سخت پریشان ہوجاتے ہیں۔ امامہ کو فرقان کے گھر روزانہ کھانا کھانے پر بھی اعتراض ہوتا ہے اور سالار کے سی فوڈ کھانے پر بھی۔ سکندر عثمان، طیبہ اور انیتا ان دونوں سے ملنے آتے ہیں اور امامہ سے بہت پیار سے ملتے ہیں۔ وہ سالار کا ولیمہ اسلام آباد میں کرنے کے بجائے اب لاہور میں کرنے کا منصوبہ بناتے ہیں۔ ڈاکٹر سبط، امامہ سے سالار کے ناروا سلوک کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو وہ شرمندہ ہی ہوجاتی ہے کیونکہ وہ بات اتنی بڑی نہیں تھی جتنی اس نے بنا ڈالی تھی۔ سالار، امامہ سے اسلام آباد چلنے کو کہتا ہے۔ تو امامہ خوف زدہ ہوجاتی ہے۔

ڈاکٹر سبط، سالار کو سمجھاتے ہیں۔ وہ خاموشی سے سنتا ہے۔ وضاحت اور صفائی میں کچھ نہیں بولتا مگر ان کے گھر سے واپسی پر وہ امامہ سے ان شکایتوں کی وجہ پوچھتا ہے۔ وہ جواباً "روتے ہوئے وہی بتاتی ہے، جو سعیدہ اماں کو بتاچکی ہے۔ سالار کو اس کے آنسو تکلیف دیتے ہیں، پھر وہ اس سے معذرت کرتا ہے اور سمجھاتا ہے کہ آئندہ جو بھی شکایت ہو، کسی اور سے نہ کرنا، ڈائریکٹ مجھے ہی بتانا، وہ اس کے ساتھ سعیدہ اماں کے گھر سے جہیز کا سامان لے آتا ہے، جو کچھ امامہ نے خود جمع کیا ہوتا ہے اور کچھ ڈاکٹر سبط نے اس کے لیے رکھا ہوتا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں گھٹیا رومانوی ناول دیکھ کر سالار کو کوفت

سالار اپنے بینک میں امامہ کا اکاؤنٹ کھلوا کر تیس لاکھ روپے اس کا حق مہر جمع کرواتا ہے۔ وہ امامہ کو لے کر اسلام آباد جاتا ہے اور ایئرپورٹ پر اسے بتاتا ہے کہ سکندر عثمان نے منع کیا تھا۔ امامہ کو شدید غصہ آتا ہے۔ گھر پہنچنے پر سکندر عثمان اس سے شدید غصہ کرتے ہیں۔

سکندر عثمان 'سالار کی اسلام آباد آمد پر پریشان ہو جاتے ہیں۔ امامہ کو اس گھر میں آکر شدید ڈپریشن ہوتا ہے۔ وہ نو سال بعد سالار کے گھر سے اپنے گھر کو دیکھتی ہے۔ دو دن رہ کر وہ واپس آجاتے ہیں۔ امامہ کہتی ہے کہ وہ اسلام آباد میں رہنا چاہتی ہے۔ سالار کی جاب یہاں ہے تو وہ مہینہ میں ایک دفعہ آجایا کرے۔ اس کی اس بات سے سالار کو دکھ ہوتا ہے 'پھر جب وہ کہتا ہے کہ اسے امریکہ چلے جانا ہے تو امامہ کہتی ہے کہ وہ دوسری شادی کرلے۔ یہ تجویز سالار کے لیے شاکنگ ہوئی ہے۔ وہ امامہ سے اس کی توقع نہیں کرتا تھا۔

سالار 'امامہ کو کراچی لے کر جاتا ہے تو وہ انیتا کے گھر جاتی ہے۔ وہ سالار سے کہتی ہے کہ وہ بھی ایسا شاندار گھر چاہتی ہے۔ جس میں سبزیوں کا فارم 'فش فارم ہو اور وہ کم از کم ایک ایکڑ کا ہونا چاہیے۔ سالار حیران رہ گیا تھا۔ عید کے موقع پر اس کو میکے کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ سالار کے ساتھ ایک پارٹی میں شراب کی موجودگی پر اس کے دل میں سالار کے لیے بدگمانی آجاتی ہے۔ جس کو سالار دور کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ اب ان چیزوں سے بہت دور جاچکا ہے۔ سالار بینک میں کام کرتا ہے۔ امامہ اس سے سود کے مسئلہ پر بحث کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے سود حرام ہے۔

امامہ 'سالار کا خیال رکھتی تھی۔ اس کی سالار کے دل میں قدر تھی 'لیکن وہ زبان سے اظہار نہیں کرتا۔ سالار البتہ جلال کے لیے اس کے دل میں جو نرم گوشہ ہے اس سے بری طرح ہرٹ ہوتا ہے۔

سالار اپنا پلاٹ بیچ کر تقریباً" ڈیڑھ کروڑ کی انگوٹھی خرید کر دیتا ہے۔ سکندر 'عثمان کو جب یہ بات پتا چلتی ہے تو وہ حیران رہ جاتے ہیں 'پھر وہ اس سے پوچھتے ہیں۔ "کہاں سے لی تھی یہ رنگ؟"

سالار بتاتا ہے کہ اس نے قیمتی ترین شاپ سے خاص طور پر یہ انگوٹھی ڈیزائن ——— کروائی ہے۔ اور تھوڑی رقم بچی تھی جو اس نے خیراتی اداروں کو دے دی ہے۔ امامہ کو اس انگوٹھی کی قیمت کا بالکل اندازہ نہیں ہے۔ سالار بھی اسے اصل قیمت نہیں بتاتا۔

امامہ کی ملاقات اتفاقاً" جلال سے ہوتی ہے۔

جلال اسے لنچ کے لیے لے جاتا ہے۔ وہ یہ جان کر بہت مرعوب ہوتا ہے کہ وہ سالار سکندر کی بیوی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سالار جس عہدے پر ہے۔ وہاں اس نے خوب کمایا ہوگا۔ ریسٹورنٹ میں اچانک فاروق صاحب آجاتے ہیں۔ جلال کے امامہ کے تعارف کرانے پر وہ چونک جاتے ہیں۔ جلال سے مل کر امامہ بہت ڈسٹرب ہو جاتی ہے۔ اس سے گاڑی بھی نہیں چلائی جاتی۔ وہ سالار کو فون کرتی ہے۔ فون آف ہوتا ہے۔ اس کی جوتی کا اسٹرپ بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ تب وہ اس کے آفس جانے کا فیصلہ کرتی ہے۔ سالار کو پتا چلتا ہے کہ وہ اپنا کریڈٹ کارڈ بھی شاپنگ سینٹر میں بھول آئی ہے۔ وہ سالار کے آفس کے باتھ روم میں جاکر فریش ہوتی ہے اور اپنی قیمتی انگوٹھی وہاں بھول آتی ہے۔ اسے بعد میں بھی وہ انگوٹھی یاد نہیں آتی۔

دو دن بعد ایک ڈنر پر فاروق صاحب 'سالار سے ملتے ہیں جب وہ اپنی بیوی کا تعارف کرانا چاہتا ہے تو وہ کہتے ہیں ڈاکٹر جلال انصر کے ساتھ لنچ کے دوران امامہ سے مل چکے ہیں۔

سالار یہ جان کر امامہ سے ناراض ہو جاتا ہے۔ وہ ناراضی میں اسے سعیدہ اماں کے ہاں بھجوا دیتا ہے۔

ڈاکٹر سبط علی سالار کو بلاتے ہیں۔ وہ نہیں جاتا تو وہ امامہ سے تعلق ختم کرنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ تب سالار ان کے پاس جاتا ہے اور امامہ سے معافی مانگ کر اسے اپنے گھر لے آتا ہے۔

ایک ہفتہ بعد سالار اسے یاد دلاتا ہے کہ امامہ انگوٹھی کہاں بھولی تھی۔ سالار 'امامہ سے ایک معاہدہ پر دستخط کراتا ہے۔ جس میں اسے سالار سے علیحدگی کی صورت میں بہت سے حقوق حاصل ہوں گے۔

ڈاکٹر سبط علی کا سلوک سالار کے ساتھ بہت روکھا ہو جاتا ہے۔ امامہ کو برا لگتا ہے 'وہ ان سے کہتی ہے 'تب ڈاکٹر سبط علی اس کو نصیحت کرتے ہیں کہ عورت کو اپنا گھر کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔

امامہ سالار کے ساتھ کھانا کھانے ریسٹورنٹ میں جاتی ہے۔ ایک ویٹر سالار کو ایک چٹ لا کر دیتا ہے "آپ یہ جگہ فوراً چھوڑ دیں۔" سالار جانے لگتا ہے 'لیکن تب ہی امامہ کے باپ اور بھائی وہاں آجاتے ہیں۔ وہ سالار پر حملہ کرتے ہیں۔

آٹھویں قسط

حاصل و محصول

اس نے سالار سے آخری خطبہ کے بارے میں ایک دن پہلے بھی پوچھا تھا۔ تب وہ جبل رحمت پر کھڑے تھے۔

"تمہیں آخری خطبہ کیوں یاد آگیا؟" سالار نے کچھ حیران ہو کر اسے دیکھا۔ وہ دونوں ابھی کچھ دیر پہلے جبل رحمت پر نوافل ادا کر کے فارغ ہوئے تھے۔

"یہیں پر آخری حج کے اجتماع سے خطاب کیا تھا نا انہوں نے؟" وہ جبل رحمت کی چوٹی کے دامن کو دیکھ رہی تھی۔

"ہاں۔" سالار نے اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے نیچے جھانکا۔ ان دونوں کے کپڑے اب ہوا سے پھڑپھڑا رہے تھے۔ وہ دوپہر کا وقت تھا۔ تیز دھوپ اور لو جیسی ہوا کے تھپیڑوں میں وہ اس سے خون جما دینے والے سوال کرنے والی تھی۔

"تمہیں ان کا خطبہ یاد ہے؟" امامہ نے اس سے پوچھا۔

"سارا تو نہیں۔" سالار یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اٹکا۔ "بس چند احکامات یاد ہوں گے۔" اس نے بات مکمل کی تھی۔

"جیسے؟" امامہ نے مدھم آواز میں دل گروہ نکال دینے والی بے رحمی کے ساتھ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا تھا۔ سالار اس کی نظروں سے نظریں ہٹا نہیں سکا۔ وہ بڑی نازک جگہ پر کھڑا کر کے اس سے اس کی زندگی کا مشکل ترین سوال پوچھ رہی تھی اور سوال کا جواب۔۔۔ ان کے درمیان آنے والی خاموشی کے وقفے میں بھی تھا۔

"مجھے ٹھیک سے وہ احکامات بھی یاد نہیں' میں ایک بار آخری خطبے کو دوبارہ پڑھوں گا۔ پھر تم پوچھ لینا۔ جو پوچھنا چاہتی ہو۔" سالار نے بچنے کی ایک آخری کوشش کی تھی اور ناکام رہا۔

"مجھے پورا یاد ہے اور آج یہاں کھڑی ہوں تو اور بھی یاد آرہا ہے۔ میں سوچ رہی ہوں' آخر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ خطبہ یہیں کیوں دیا تھا۔ اس پہاڑ کے دامن میں کھڑے ہو کر جس پر حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا رضی اللہ تعالیٰ عنہ چالیس سال کے بعد آپس میں ملائے اور بخشے گئے۔" وہ اب کچھ سوچنے والے انداز میں بول رہی تھی۔

"شاید اس لیے کیونکہ دنیا کا آغاز انہیں دو انسانوں سے ہوا اور دین مکمل ہونے کا اعلان بھی اسی میدان میں ہوا اور اسی میدان میں ایک دن دنیا کا خاتمہ ہو گا۔" سالار لقمہ دیے بغیر نہیں رہ سکا۔

امامہ ہنس پڑی تھی۔

"تم ہنسیں کیوں؟" سالار الجھا۔

"تم تو کہہ رہے تھے تم کو وہ چند احکامات بھی یاد نہیں۔۔۔ اب یہ کیسے یاد آگیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

اس میدان میں دین مکمل ہونے کا اعلان کیا تھا۔"

سالار لاجواب ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ امامہ کو کوئی توجیہہ ڈھونڈ کر پیش کرتا اس نے اسی پُرسوچ انداز میں اس سے کہا۔

"مجھے لگتا ہے وہ آخری خطبہ دنیا کے ہر انسان کے لیے تھا۔ ہم سب کے لیے... آج کے آدم اور حوا کے لیے... اگر وہ سارے احکامات جو اس آخری خطبہ کا حصہ تھے ہم سب نے اپنائے ہوتے یا اپنا لیں تو دنیا اس بے سکونی اور بگاڑ کا شکار نہ ہوتی... جہاں ہم آج کھڑے ہیں... اگر وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی امت کے لیے آخری وصیت تھی تو ہم بہت بدقسمت ہیں کہ ان کی سنت تو ایک طرف ان کی وصیت تک ہمیں یاد نہیں... عمل کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔"

وہ کچھ جذباتی انداز میں بولتی گئی تھی اور سالار کو پتہ تھا یہ گفتگو کہاں جا رہی تھی۔ وہ عورت ساڑھے نو سال پہلے بھی اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکال سکتی تھی اور تب بھی نکال رہی تھی۔

"تم کو سود کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات پتا ہیں نا اس آخری خطبے کے؟" وہ تلوار اس کی گردن پر آگری تھی جس سے وہ اب تک بچنے کی کوشش کرتا آیا تھا۔ وہ کس جگہ پر کھڑی اس سے کیا پوچھ رہی تھی۔ ایسی ندامت تو کبھی خانہ کعبہ میں اللہ کے سامنے کھڑا ہو کر اسے نہیں ہوئی تھی جتنی اس وقت جبل رحمت پر اس جگہ کھڑے ہو کر اسے ہوئی تھی جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کے بارے میں احکامات دیے تھے۔ سالار کو چند لمحوں کے لیے لگا جیسے جبل رحمت پر پڑے ہر پتھر نے اس پر لعنت بھیجی تھی۔ پسینہ ماتھے پہ نہیں... پیروں کے تلووں تک آیا تھا۔ اسے لگا تھا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑا تھا اور بس وہ تھے جن کی نظروں میں اس کے لیے ملامت نہیں افسوس تھا... پھر وہ وہاں ٹھہر نہیں سکا سر جھکائے تیز قدموں سے امامہ کا انتظار کیے بغیر جبل رحمت سے اُترتا چلا گیا۔ وہ رحمت کا حق دار نہیں تھا تو جبل رحمت پر کیسے کھڑا ہو پاتا۔ اسے نیچے اتر کر محسوس ہوا تھا۔

اور آج امامہ نے وہ سوال حرم میں کر دیا تھا۔ سالار نے اس سے اس بار یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ اس سے کیا مانگے گی۔ اس نے اس کے بالمقابل کھڑے ہو کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حرم کے صحن سے نکلنے سے پہلے امامہ سے کہا تھا۔

"میں سود جب بھی چھوڑوں گا، تمہارے لیے نہیں چھوڑوں گا... نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے چھوڑوں گا۔" امامہ نے اس کے اعلان کو سنا اور پھر بڑی ٹھنڈی آواز میں کہا۔

"تو پھر ان ہی کے لیے چھوڑ دو۔"

سالار ہل نہیں سکا۔ یہ عورت اس کی زندگی میں پتا نہیں کس لیے آئی یا لائی گئی تھی۔ اس کو اکنامکس اور حساب کے ہر سوال کا جواب آتا تھا۔ سوائے اس ایک جواب کے۔

"تم تو حافظ قرآن ہو سالار... پھر بھی اتنی بڑی Violation (خلاف ورزی) کر رہے ہو، قرآن پاک اور اللہ کے احکامات کی۔" امامہ نے اس کے ساتھ حرم سے باہر جاتے ہوئے کہا۔

"تم جانتی ہو میں انویسٹمنٹ بینکنگ کروا رہا ہوں لوگوں کو اور..."

امامہ نے سالار کی بات کاٹ دی۔ "تم کو یقین ہے کہ تم انویسٹمنٹ بینکنگ میں جو بھی کر رہے ہو اس میں سود کا ذرہ تک شامل نہیں ہے؟"

سالار کچھ دیر تک بول نہیں سکا، پھر اس نے کہا۔

"تم بینکنگ کے بارے میں میرا موقف (stance) جانتی ہو... چلو میں چھوڑ بھی دیتا ہوں یہ... بالکل، ہر مسلم

پھوڑ دے بینکوں کو۔۔۔ اس کے بعد کیا ہو گا۔۔۔ حرام حلال میں تبدیل ہو جائے گا؟" اس نے بڑی سنجیدگی سے اس سے کہا تھا۔

"ابھی تو ہم حرام کام ہی سہی 'مگر اس سسٹم کے اندر رہ کر اس سسٹم کو سمجھ رہے ہیں 'ایک وقت آئے گا جب ہم ایک متوازی اسلامک اکنامک سسٹم لے آئیں گے اور وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے سے نہیں آئے گا۔"

"اور ایسا وقت کبھی نہیں آئے گا۔" امامہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کم سے کم میری اور تمہاری زندگی میں تو نہیں۔"

"تم ایسے کیوں کہہ رہی ہو؟"

"سود جن لوگوں کے خون میں رزق بن کر دوڑنے لگ جائے 'وہ سود کو مٹانے کا کبھی نہیں سوچیں گے۔"

سالار کو ایک لمحہ کے لیے لگا۔ امامہ نے اس کے چہرے پر طمانچہ دے مارا تھا۔ بات کڑوی تھی۔۔۔ پر بات سچی تھی۔ تھوک سکتا تھا۔۔۔ پر کڑواہٹ زائل نہیں کر سکتا تھا۔

"میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم اگر چیزوں کو بدل نہیں سکتے تو اپنی قابلیت ایک غلط کام کو عروج پر پہنچانے کے لیے مت استعمال کرو۔"

وہ اسی امامہ کی محبت میں گرفتار ہوا تھا 'اور آج وہ بیوی بن کر ویسی ہی باتیں دہرا رہی تھی تو سالار کو خفگی ہو رہی تھی یا شاید وہ شرمندگی تھی 'جو اسے امامہ سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہنے دے رہی تھی۔ اس نے کیا 'کیا نہیں کیا تھا۔ اس عورت کو مطیع اور فرماں بردار کرنے کے لیے۔۔۔ اور ابھی کچھ دیر پہلے حرم میں وہ اس سے اپنی محبت اور اطاعت کا اعلان بھی کر رہی تھی۔ اپنی غیر مشروط اور دائمی محبت اور وابستگی کا۔۔۔ اور اس اعلان کے بعد بھی وہ صحیح اور غلط کی واضح تمیز لیے بیٹھی تھی 'جو صحیح تھا وہ محبت اور اطاعت بھی غلط نہیں کہلوا سکتی تھی۔ امامہ ہاشم کی زبان سے۔

سالار سکندر کو اس سے ایک بار پھر حسد ہوا تھا۔ کیا اس کی زندگی میں ایسا کوئی وقت آنا تھا جب وہ امامہ ہاشم کے سامنے دیوبنتا اور بنا ہی رہتا 'بونا نہ بنتا۔۔۔ فرشتہ دکھتا اور دکھتا ہی رہتا 'شیطان نہ دکھتا؟

"میں آخری خطبہ پڑھوں گا۔" کہنا وہ کچھ اور چاہتا تھا اور کہہ کچھ اور دیا تھا۔

"مجھ سے سنو گے؟" امامہ نے اس کا ہاتھ تھامتے حرم سے باہر نکلتے ہوئے بڑے اشتیاق سے کہا۔

"تمہیں زبانی یاد ہے؟" سالار نے بغیر حیران ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

"اتنی بار پڑھا ہے کہ لگتا ہے زبانی دہرا سکتی ہوں۔" وہ اب جیسے کچھ یاد کر رہی تھی۔

"سناؤ۔۔۔" سالار نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"آدم۔۔۔" مکہ کی زمین پر کئی سو سال بعد اس خطبہ کو حوا کی زبان سے سننے کی تیاری کر رہا تھا 'جو کئی سو سال پہلے آخری نبی الزماںؐ نے دین کی تکمیل کا اعلان کرتے ہوئے دنیا بھر کے انسانوں کے لیے دیا تھا۔۔۔ صرف مسلمانوں کے لیے نہیں۔

☼ ☼ ☼
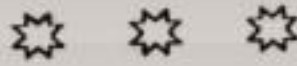
سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں 'ہم اسی کی حمد و ثنا کرتے ہیں اور اسی سے مدد و مغفرت چاہتے ہیں اور اسی کے سامنے توبہ کرتے ہیں اور اسی کے دامن میں اپنے نفس کی خرابیوں اور برے اعمال سے پناہ چاہتے ہیں۔ جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت دے دے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جس کو وہ گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور وہ اکیلا ہے اور

اس کا کوئی شریک نہیں اور میں اعلان کرتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کا بندہ اور رسول ہے۔
اے لوگو! میں تمہیں اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں اور تمہیں اس کی اطاعت کا حکم دیتا ہوں اور اپنے خطبے کا آغاز نیک بات سے کرتا ہوں۔ لوگو! سنو میں تمہیں وضاحت سے بتاتا ہوں کیونکہ شاید اس کے بعد کبھی تم سے اس جگہ مل نہ سکوں۔
اچھی طرح سن لو تم میں سے جو حاضر نہیں، وہ یہ باتیں غیر حاضر لوگوں تک پہنچا دے، ممکن ہے اگلے لوگ یہاں موجود لوگوں کی نسبت ان باتوں کو زیادہ اچھی طرح یاد رکھیں اور ان کی حفاظت فرمائیں۔
اے لوگو... اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام قرار دیا ہے اور میں آج سے تمام سود کالعدم قرار دیتا ہوں اور سب سے پہلے وہ سود معاف کرتا ہوں جو لوگوں نے میرے چچا عباس بن عبدالمطلب کو ادا کرنا ہے۔
البتہ تم کو اپنی اصل رقم لینے کا حق ہے، جس میں نہ اوروں کا نقصان ہے نہ تمہارا...

☆ ☆ ☆
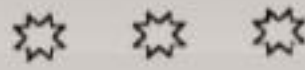
پینتیس سالہ غلام فرید ذات کا کمہار اور پیشے کے لحاظ سے ایک اسکول کا چوکیدار تھا۔ گاؤں میں رہتا تھا، لیکن شہر میں بسنے کے خواب دیکھتا تھا اور خواب صرف شہر میں آباد ہونے کا نہیں تھا جو وہ اپنی آنکھوں میں سجائے پھرتا تھا۔ اسے راتوں رات امیر ہونے کا بھی بڑا شوق اور شوق سے زیادہ حسرت تھی۔ ویسا امیر ہونے کا، جیسے اس کے کئی دوست گاؤں سے دبئی یا سعودی عرب جاکر ہو گئے تھے۔ اس کے پاس وسائل نہیں تھے۔ ورنہ وہ انہیں دوستوں میں سے کسی کی منت سماجت کر کے خود بھی سعودی عرب یا دبئی جاکر ہی امیر ہوتا، وسائل تو شاید وہ کسی نہ کسی طرح پیدا کر ہی لیتا، اگر اس کی شادی بائیس سال میں ہی اس کی ماں نے اپنے بھائی کی بیٹی سے نہ کر دی ہوتی۔
وہ سات بہنوں کا اکلوتا اور سب سے بڑا بھائی تھا، جس کی شادی کا خواب ماں نے اس کے پیدا ہوتے ہی سجا لیا تھا۔ دھوم دھام کی شادی نے اگلے کئی سال غلام فرید کو وہ قرض اتارنے میں مصروف رکھا۔ جو اس کی شادی پر ماں، باپ نے خاندان والوں سے چھوٹی بڑی رقمیں کر کے لیا تھا اور جب وہ قرض ختم ہوا تو اسے، بہنوں کی شادی پر قرض لینا پڑا اور اس بار خاندان والوں سے قرض نہ ملنے پر اس نے سود پر قرض لیا تھا۔ سات بہنیں تھیں اور ہر سال کسی نہ کسی کی شادی آجاتی... پچھلا قرضہ وہیں کھڑا رہتا۔ مزید قرضہ سر پر چڑھ جاتا اور پھر ایک کے بعد ایک بچے کی پیدائش...
غلام فرید کو کبھی کبھار لگتا اس کا نام غلام قرض ہونا چاہیے تھا غلام فرید کے بجائے...
شادی کے تیرہ سالوں میں قرض کی ہر رقم تو اس نے اتار دی تھی، لیکن سود کی رقم اس کے سر پر اس کے سر کے بالوں سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ اس کی بیوی بھی اسی اسکول کی عمارت میں صفائی کا کام کرتی تھی۔ جس اسکول میں وہ چوکیدار تھا۔ دو بڑے بچے بھی گاؤں کی دو دکانوں پر کام کرتے تھے۔
ایک چائے کے ایک کھوکھے پر کام کرتا تھا۔ دوسرا ایک ورکشاپ میں موٹر سائیکلیں دھونے کا کام، دس گیارہ سال کی عمر میں وہ دو بچے یہ ہی کر سکتے تھے۔ انہیں تنخواہ نہیں دیہاڑی ملتی تھی اور اسی دیہاڑی سے گھر کی دال روٹی چلتی تھی، کیونکہ نسیمہ اور غلام فرید کی تو ساری کی ساری تنخواہ ہر ماہ سود میں چلی جاتی تھی۔ کئی سالوں سے سود کی وہ سل پھر بھی ان کے سینے سے ہٹتی ہی نہ تھی۔ بوجھ تھا کہ بڑھتا ہی گیا تھا۔
غلام فرید کو دن میں چوکیداری کرنی ہوتی تھی، پر عجیب بات تھی کہ نیند اسے راتوں کو بھی نہیں آتی تھی۔ وہ صرف اتنا پڑھا لکھا تھا کہ جمع تفریق اور جوڑ توڑ کر کے قرآن پاک پڑھ لیتا... اور اس کی زندگی بس جمع تفریق ہی رہ گئی تھی اور اس جمع تفریق نے قرآن پاک کو جوڑ توڑ کر کے پڑھنے کا وقت بھی کھا لیا تھا۔
پینتیس سال کی عمر میں بھی کئی بار اسے لگتا وہ پچاس سال کا تھا۔ کئی بار اسے لگتا وہ سو سال کا ہو گیا تھا اور کئی بار

اسے لگتا وہ مر گیا ہے۔ مرنے والا ہے' مر رہا ہے' پتا نہیں وہ عمر کا کون سا سال ہوتا ہے جو ایسی کیفیت کے ساتھ گزرتا ہے۔

کئی بار وہ سوچتا تھا' وہ ایک رات چپکے سے بیوی' بچوں کے ساتھ گاؤں سے بھاگ جائے۔ کسی دوسرے شہر... دنیا کے کسی دوسرے کونے پر... جہاں پر وہ اس سود سے آزاد ہوتے... غلام فرید جی بھر کر رات کو سوتا اور پھر وہ اس کی۔ بیوی اور بچے جو کماتے خود پر خرچ کرتے... تین وقت کا ڈھیر سارا کھانا پکاتے اور کھاتے پیٹ بھر کے... اور جو بچتا وہ کسی کو دے دیتے... برتن چاٹ چاٹ کر اور روٹی کے آخری لقمے سے پلیٹیں پونچھنے کے بجائے... سال میں دس بیس نہیں تو دو چار تو اچھے سے جوڑے سلواتے اپنے اور سب بچوں کے لیے... گاؤں کے امیر خاندانوں کے بچوں اور افراد کی اُترن پہننے کے بجائے... اور لنڈا بازار سے خریدے ہوئے کپڑے پہن کر عیدیں گزارنے کے بجائے...

اور پھر ایک گھر بناتے۔ اپنا گھر... پکی اینٹوں اور پلستر والا پکی چھت والا گھر... شاید ڈبل اسٹوری ہی بنوا لیتے... اور صحن کے فرش میں چپس ڈلواتے... پانی کی موٹر لگواتے... شاید اے سی بھی... اور فریج... ٹی وی... اچھا سا فرنیچر... اور لش پشی کرتے پردے... اور چینی کے برتن اور پھر وہ اس کے بچے زمین کے بجائے ٹیبل اور کرسیوں پر بیٹھ کر کانٹے اور چمچے سے ان چینی کے برتنوں میں کھانا کھاتے...

غلام فرید کے خوابوں کی ریل گاڑی ساری رات چھکا چھک چلتی رہتی... ہر اسٹیشن پر رکتی کچھ اور خواب اٹھاتی اور پٹڑی پر پھر دوڑنے لگتی اور پھر دوڑتے دوڑتے وہیں آکر رک جاتی' جہاں سے وہ چلی تھی... رات گزر جاتی... زندگی بھی گزر رہی تھی اور غلام فرید کو پتا تھا وہ اپنی رات کو خوابوں میں گزار سکتا ہے' زندگی کو نہیں۔

گاؤں سے بھاگ جانا آسان تھا۔ مگر ان لوگوں سے چھپ جانا نہیں جن سے وہ قرضہ لیے بیٹھا تھا اور قرضہ ادا ہونے کے باوجود سود وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔ وہ لوگ اس کی چمڑی ادھیڑنے پر قادر تھے اور اس کو کتوں کے سامنے بھی پھنکوا دیتے... اور غلام فرید بچوں اور ایک بیوی کے ساتھ ساری عمر کے لیے کہاں چھپ جاتا کہ دوبارہ کسی کو نظر نہ آتا۔ اپنے اور اپنی بیوی کے خاندان والوں کو ہمیشہ کے لیے کیسے چھوڑ دیتا کہ دوبارہ کبھی رابطہ ہی نہ کرتا۔

راہ فرار غلام فرید کے پاس نہیں تھی اور اگر کوئی تھی تو صرف ایک... وہ امیر ہو جاتا اور پتا نہیں کیوں' لیکن غلام فرید کو لگتا تھا کہ وہ امیر ہو سکتا تھا۔

امیر ہونا اس وقت غلام فرید کی زندگی کی واحد ترجیح تھی۔ حالات اور ہوتے اور اس کا بال بال سود میں نہ بندھا ہوتا تو شاید غلام فرید اس وقت اپنی زندگی کو مختلف ترجیحات کے ساتھ گزار رہا ہوتا۔ وہ اس اسکول کے دوسرے نچلے درجے کے ملازمین کی طرح تنخواہ اور چھوٹی موٹی محنت مزدوری میں بڑی اچھی زندگی گزار رہا ہوتا' اپنے بچوں کے بارے میں سوچ رہا ہوتا' کس کو کیا پڑھانا ہے اور کیا مستقبل بنانا ہے' مگر غلام فرید کو اس سُود نے کسی قابل نہیں چھوڑا تھا جو اسے ورثے میں ملا تھا اور جس نے اسے عمر سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اے لوگو! میں نے تمہارے پاس ایسی چیز چھوڑی ہے کہ تم اسے مضبوطی سے تھامے رہو گے تو میرے بعد ہرگز گمراہ نہیں ہو گے۔ یعنی اللہ کی کتاب اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور تم لوگ غلو سے بچو کیونکہ تم سے پہلے لوگ اسی کے باعث ہلاک ہوئے۔

☼ ☼ ☼

چنی غلام فرید کی آخری اولاد تھی۔ اگر نسیمہ کی زندگی رہتی اور وہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہو گیا تو شاید وہ آخری اولاد

نہ ہوئی' بیچ کی اولاد ہوتی اور اس کا نمبر کیا ہوتا اس کا اندازہ کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر وہ غلام فرید کی آخری اولاد زندگی کی ایک اسٹیج پر اس کی واحد اولاد رہ جانے والی تھی' یہ غلام فرید کو نہیں پتا تھا' پتا ہوتا تو شاید وہ واحد اولاد بھی زندہ نہ رہ پاتی۔

ڈیڑھ سالہ چنی کو اس کی پیدائش سے پہلے کئی بار مارنے کی کوشش کی گئی تھی۔ نسیمہ کو جب اپنے نویں بار حاملہ ہونے کا اندازہ ہوا تو اس نے گاؤں میں دائی سے ملنے والی ہر اس چیز کا استعمال کیا تھا' جس سے اسقاط حمل ہو جاتا۔ چنی کو تو کچھ نہیں ہوا' لیکن خود نسیمہ ان مضر صحت ادویات کے استعمال سے کئی قسم کی بیماریوں کا شکار ہو گئی۔

چنی کو مارنے کی ایک کوشش تب بھی کی گئی' جب ساتویں مہینے طبیعت زیادہ خراب ہونے پر نسیمہ کو شہر جانا پڑا اور وہاں الٹرا ساؤنڈ میں اپنے ہونے والے بچے کی جنس کا اسے پتا چل گیا تھا۔ نویں اولاد لڑکی ہونے کا مطلب تھا کہ اس کی بیٹیوں کی تعداد چھ ہو جاتی..... نسیمہ کو جیسے غش آگیا تھا۔ سات بہنیں بیاہتے بیاہتے غلام فرید اور اس کا یہ حال ہو گیا تھا۔ چھ بیٹیاں بیاہتے ہوئے انہیں اب کون سے دوزخ سے گزرنا تھا۔ نسیمہ نے سوچا تھا اور اس خیال نے آخری دو' تین مہینے میں ہر وہ بد احتیاطی کرنے پر اسے اکسایا تھا جس سے وہ بچی جان سے چلی جاتی..... یہ نسیمہ کی خوش قسمتی تھی کہ ان سب بے احتیاطیوں میں وہ خود جان سے ہاتھ نہیں دھو بیٹھی۔

چنی صحت مند پیدا ہوئی تھی۔ یعنی صحت کے اس معیار کے مطابق صحت مند تھی' جس پر اس کے بہن بھائی اور ماں' باپ پورا اترتے تھے۔ اس کا پیدا ہونا جیسے اس کی اپنی ذمہ داری بن گئی تھی۔ (اس کی ماں کی لاتعداد اسقاط حمل کی کوششوں کے بعد.....) اور جیسے اس کا پلنا بھی اس کی اپنی ہی ذمہ داری ہو گیا تھا۔ ماں کو ہفتے بعد ہی واپس ڈیوٹی پر جانا تھا۔ یہ کوئی شہر نہیں تھا کہ میٹرنٹی لیو جیسی سہولت سے اسے نوازا جاتا اور وہ بھی نویں بچے کی پیدائش پر۔ باپ کے پاس پہلے ہی اپنے بچوں کے لیے وقت نہیں تھا۔ وقت شاید ایک بہت بڑا حق تھا اور ایسا حق جس سے کوئی وہاں واقف ہی نہیں تھا۔ غلام فرید کو اگر احساس ہوا تھا تو صرف یہ کہ اس کے سر اور کندھوں کا بوجھ ایک بیٹی کی پیدائش نے بڑھا دیا تھا۔

دو کمروں کا وہ گھر جو غلام فرید کا واحد خاندانی ترکہ تھا۔ چنی کی پیدائش کے چند ہفتوں بعد سود میں گروی رکھا گیا تھا۔ اسکول نے غلام فرید کی اس مشکل وقت میں مدد کی اور اسے ایک کوارٹر مل گیا رہائش کے لیے' جس میں صرف ایک کمرہ تھا' مگر وہ بھی غنیمت تھا' فی الحال غلام فرید کو..... پر چنی' ماں باپ کو اس حوالے سے خوب یاد رہی کہ اس کی پیدائش نے انہیں بے گھر کیا تھا۔ چنی کی خوش قسمتی یہ تھی کہ روایتی انداز میں اس پر منحوس کا لیبل نہیں لگا اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ غلام فرید کو اپنے ہر بچے کی پیدائش پر کوئی نہ کوئی بری خبر ملتی رہی تھی۔ اسے کوئی بھی ایسی اولاد یاد نہیں تھی' جس کے دنیا میں آنے سے غلام فرید کی زندگی میں کوئی آسانی پیدا ہوئی تھی۔

نحیف و نزار اور سانولی رنگت والی چنی سارا دن گرمی میں بان کی ایک چارپائی پر ایک کپڑے پر پڑی رہتی۔ روتی' کلبلاتی' پھر خود ہی انگوٹھا چوستی اور سو جاتی..... کسی بہن کو خیال آجاتا تو چنی کو اس کے سستے سے پلاسٹک کے اس فیڈر میں دودھ مل جاتا' جس میں اس کے ہر بہن' بھائی نے دودھ پیا تھا اور جو اتنے سالوں میں اتنا گدلا' میلا اور گھس گیا تھا کہ اس میں ڈالا ہوا دودھ بھی میلا دکھنے لگتا۔ وہ بلاشبہ جراثیم کی آماجگاہ تھا' لیکن چنی کی خوش قسمتی یہ تھی کہ وہ غریب کی اولاد تھی اور غریب کی اولاد بھوک سے مرجاتی ہے۔ گندگی سے نہیں۔

پورے دن میں ایک آدھ بار ملنے والا دودھ کا فیڈر وہ واحد غذا تھا' جس پر چنی سارا دن گزارتی تھی۔ اس سے زیادہ خوراک غلام فرید کے گھر میں کسی بچے کو نہیں ملی تھی۔ سوائے اس کے پہلے دو بیٹوں کے' نسیمہ شام کو تھکی ہاری آتی اور جو بھی روکھی سوکھی ملتی وہ کھا کر کمرے کے ایک کونے میں اپنے کسی بچے سے ٹانگیں دبواتی لیٹتی اور وہیں سو

جاتی' اسے خیال ہی نہیں آتا تھا کہ اس کمرے میں اس کی ایک نوزائیدہ اولاد بھی تھی۔ ہاں کبھی کبھار وہ اس وقت چنی کو ضرور دیکھنے بیٹھ جاتی تھی۔ جب بڑی بچیوں میں سے کسی کو اچانک وہم ہوتا کہ چنی شاید مر گئی تھی' کیونکہ وہ کبھی سانس نہیں لے پاتی اور کبھی اس کا جسم اتنا ٹھنڈا اور نیلا ہو جاتا کہ نسیمہ کو لگتا شاید اس کا بوجھ واقعی کم ہو گیا تھا۔ لیکن۔۔۔ لیکن چنی اپنے ماں' باپ کے سب ارمانوں پر پانی پھیرتے ہوئے پھر سانس لینا شروع کر دیتی۔ پتا نہیں یہ اس کی ڈھٹائی تھی یا غلام فرید اور اس کی بیوی کی وہ بدقسمتی جس نے سوچ لیا تھا کہ وہ کبھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔

بھوک واحد مسئلہ نہیں تھا جس کا سامنا چنّی کو تھا۔ ایک اور مسئلہ یہ بھی تھا کہ وہ سارا سارا دن پیشاب اور پاخانہ میں لتھڑی پڑی رہتی اور اس کی بہنیں' ماں کی ہدایات کے باوجود اسے صاف نہیں کرتیں۔ ان کا قصور نہیں تھا۔ سات اور نو سال کی بچیوں کو اگر چنی سے کراہیت محسوس ہوتی تھی تو ٹھیک ہی ہوتی تھی۔ نسیمہ گھر آتی' پہلے ان دونوں کو پیٹتی' پھر چنی کو دھوتی اور بچوں میں سے کسی کو پکڑا دیتی۔ چنی کے جسم پر کھجلی ہوئی اور پھر اس حد تک ہوئی کہ اس کی جلد جیسے عادی ہو کر خود ہی ٹھیک ہوتی گئی تھی شاید چنی کی یادداشت کام کرتی تو وہ بتا سکتی کہ اسے سب سے زیادہ تکلیف کس چیز سے ہوتی تھی' بھوک سے' جسم پر پھیلے ہوئے ان گرمی دانوں سے' جو جلدی خارش میں تبدیل ہو گئے تھے اور ان سے کئی بار پانی بھی رسنے لگتا تھا یا پھر اس گندگی سے جس میں وہ سارا دن اور ساری رات لتھڑی پڑی رہتی تھی اور کوئی اس کی پروا نہیں کرتا تھا۔ اس چھوٹے سے کمرے میں ہر جگہ سب رات کو بے سدھ آڑھے ٹیڑھے سوئے ہوئے ہوتے تھے صرف غلام فرید تھا جو باہر چارپائی ڈال کر کبھی بیٹھا اور کبھی لیٹا رہتا تھا۔

کئی ہفتوں تک کسی کو یہ خیال ہی نہیں آیا کہ چنی کی پیدائش رجسٹر کروانی چاہیے۔ اس کا کوئی نام ہونا چاہیے۔ چنی نام اسے اس کی ماں نے اس کی جسامت دیکھ کر دیا تھا اور سب اسے اسی نام سے پکارنے لگے تھے۔ پھر گاؤں میں حفاظتی ٹیکوں کی مہم والے آئے تو غلام فرید کو چنی کا نام اور پیدائش رجسٹر کروانی پڑی۔ غلام فرید نے اس کی پیدائش رجسٹر کروانے کے لیے بھی تین سو روپے کسی سے ادھار لیے تھے اور وہ ادھار بھی گاؤں کی مسجد کے امام سے۔۔۔ اور ان تین سو روپے نے غلام فرید کی زندگی میں کیا کردار ادا کرنا تھا۔ اس کا اندازہ نہ غلام فرید کو تھا' نہ ہی اس کی اس نویں اولاد کو' جسے رجسٹر میں کنیز کا نام دیا گیا تھا۔ یہ نام چنی کے لیے کس نے چنا تھا' کسی کو یاد نہیں۔ شاید محلے کی کسی بوڑھی عورت نے۔۔۔ یہ سوچتے ہوئے کہ انسان پر نام کا اثر آتا ہے اور عورت کے لیے سب سے اچھی صفت اطاعت اور فرماں برداری ہے' جو کنیز نام رکھے جانے پر چنی میں بھی کوٹ کوٹ کر بھر جائے گی۔

گاؤں میں کسی کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ کنیز ولد غلام فرید عرف چنی کو نہ اس نام کی ضرورت تھی' نہ اس صفت کی۔۔۔ اسے اللہ تعالیٰ نے کسی اور کام کے لیے چنا تھا۔

☆ ☆ ☆

"دیکھو میں نے حق پہنچا دیا ہے۔ بس اگر کسی کے پاس امانت رکھوائی گئی ہے تو وہ اس بات کا پابند ہے کہ امانت رکھوانے والے کو امانت پہنچا دے اور بے شک تم سب کو اللہ کی طرف لوٹنا اور حساب دینا ہے۔"

☆ ☆ ☆
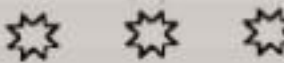
امام صاحب سے تین سو روپے کا وہ قرض ہی تھا جس نے غلام فرید کو پہلی بار یہ احساس دلایا کہ امیر بننا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا وہ سمجھتا تھا اور اس گاؤں کے اور بہت سے لوگ تھے جو اسی کی طرح کئی سال یہ خواب پالنے کے بعد بالآخر وہ آسان راستہ یا راستے ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے تھے جن سے امیر بنا جا سکتا تھا۔

امام مسجد بھی ان ہی لوگوں میں شامل تھے، جو صرف آخرت میں ہی جنت نہیں چاہتے تھے، بلکہ اس دنیا میں بھی انہیں جنت کا عیش و آرام چاہیے تھا۔ انہوں نے غلام فرید کو تین سو روپے کا قرض تو دے دیا تھا، مگر ساتھ اس کی یہ ذمہ داری بھی لگادی تھی کہ وہ اس اسکول کے مالکان سے مسجد کے لیے چندہ لے کر انہیں دے۔

غلام فرید نے جہاں مولوی صاحب کو یہ یقین دلایا تھا کہ اسکول کے مالکان بڑے فیاض ہیں، وہاں یہ جھوٹ بھی بولا تھا کہ وہ غلام فرید کو بہت مانتے تھے، اور وہ گاؤں میں کسی کو کچھ بھی دینے دلانے کے لیے غلام فرید سے اکثر مشورہ کرتے تھے اور مسجد کے لیے چندہ تو غلام فرید کے لیے ویسے ہی بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

مولوی صاحب نے غلام فرید کی باتوں پر اندھا اعتماد تو یقیناً" نہیں کیا تھا، ورنہ ایک ہزار روپے کی وہ رقم جو اس نے قرض مانگی تھی، اس کے بجائے صرف تین سو روپے اسے نہ دیتے.... لیکن انہوں نے پھر بھی کسی نہ کسی حد تک غلام فرید کی بات پر یقین ضرور کیا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ اسکول کے مالکان غلام فرید کو شکل سے تو پہچانتے ہوں گے، لیکن اس کا نام کوئی نہیں جانتا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اسکول میں کوئی ایک چوکیدار نہیں تھا۔ اسکول کی وسیع و عریض عمارت میں مختلف اوقات میں تین، چار چوکیدار پہرہ دیتے تھے اور غلام فرید ان میں سے ایک تھا اور غلام فرید کو اپنی حیثیت اور اوقات کے بارے میں پتا بھی تھا۔

مولوی صاحب سے تو غلام فرید نے جھوٹ بولا تھا۔ لیکن مولوی صاحب کے بار بار اصرار پر حیلے بہانے بنانے کے بعد اس نے بالآخر اسکول کے مالکان سے مسجد کے لیے چندے کی بات کر ہی لی تھی۔ اسکول کے اس مالک نے مولوی صاحب کو بلوا کر اس چندے کے حوالے سے یہ تفصیلات معلوم کی تھیں کہ انہیں چندہ کس لیے چاہیے تھا اور مولوی صاحب نے چھوٹے موٹے اخراجات کی ایک لمبی تفصیل اسکول کے مالک کے سامنے رکھ دی تھی۔

اسکول کے مالک نے ان اخراجات کی تفصیلات جاننے کے بعد مسجد کے لیے نہ صرف اس وقت کچھ رقم مہیا کی تھی، بلکہ ہر مہینے اسکول کے اخراجات کے لیے ایک معقول رقم دینے کا وعدہ بھی کرلیا تھا۔ مولوی صاحب کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا تھا۔ ان کا تین سو روپے کا دیا قرض ہزاروں میں تبدیل ہو کر ان کی طرف لوٹا تھا۔ غلام فرید جیسے معمولی آدمی کی حیثیت ان کی نظر میں ایک دم بڑھ گئی تھی اور غلام فرید کو اس گاؤں میں پہلی دفعہ کسی نے عزت دی تھی، وہ بھی گاؤں کی مسجد کے امام نے.... جس نے نہ صرف اس جمعے کے خطبے میں لاؤڈ اسپیکر پر اسکول کی انتظامیہ اور مالکان کی دردمندی کے قصیدے پڑھے تھے بلکہ غلام فرید کی کوششوں کو بھی سراہا تھا۔ جس کی کوششوں سے مسجد کے پاس یہ رقم آئی تھی۔

مسجد میں جمعے کے خطبے کے دوران بیٹھے ہوئے غلام فرید کا سینہ خوامخواہ میں چوڑا ہو گیا تھا اس دن۔

اسکول کے مالک نے یہ رقم ہر ماہ غلام فرید کے ذریعے ہی مولوی صاحب کو پہنچانے کا وعدہ کیا تھا اور اس کے ساتھ غلام فرید کو یہ ذمہ داری بھی سونپ دی تھی کہ وہ مسجد میں اس رقم کے صحیح استعمال پر نظر رکھے، اور یہ دیکھتا رہے کہ وہ رقم ان چیزوں پر خرچ ہو رہی ہے۔ جن اخراجات کا ذکر اس فہرست میں تھا جو مولوی صاحب نے اسکول کے مالک کو دی تھی۔ غلام فرید کو سونپی جانے والی اس ذمہ داری نے مولوی صاحب کے لیے اس کی اہمیت کو دگنا کردیا تھا۔ اگر مولوی صاحب نے یہ رقم واقعی مسجد کے انتظام و انصرام پر لگانی ہوتی تو انہیں غلام فرید کی اس طرح عزت و قدر کرنے اور جتانے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ مگر مولوی صاحب کو یہ رقم اپنے لیے چاہیے تھی ______ گاؤں کے دوسرے زمین دار اور صاحب حیثیت لوگوں سے وصول پائے جانے والے چندوں کی طرح جن کے بارے میں کوئی مولوی صاحب سے استعمال کے حوالے سے سوال جواب نہیں کرتا تھا۔

البتہ ان سب لوگوں کو جمعہ کی نماز کے خطبے کے دوران لاؤڈ اسپیکر پر اس چندے کا اعلان چاہیے ہوتا تھا اور مولوی

صاحب اس اعلان کو قصیدوں کے تڑکے کے ساتھ پیش کرنے کے ماہر تھے۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ کسی نے مسجد کے لیے دیے جانے والے پیسوں کے حوالے سے جواب دہی کا سسٹم بنانے کی کوشش کی تھی جو مولوی صاحب کو قابل قبول نہیں تھا، لیکن چندے کی ماہانہ رقم کو ٹھکرانے کا حوصلہ بھی ان میں نہیں تھا۔

اسکول کا مالک وہاں دوسرے مہینے آیا تھا اور مولوی صاحب نے غلام فرید کے ساتھ مل کر مسجد میں ہونے والی تمام مرمتیں اسے دکھائی تھیں۔ وہ مطمئن ہو کر لوٹا تھا۔ مگر یہ صرف اسی مہینے ہوا تھا۔ دوسرے مہینے غلام فرید کے ہاتھ سے وصول پائی جانے والی رقم کا مولوی صاحب نے کیا، کیا تھا، اس کا غلام فرید کو اندازہ بھی نہیں ہو سکا۔ وہ مسجد میں دو چار بار گیا تھا اور اس کا خوب اچھی طرح استقبال کیا تھا مولوی صاحب نے۔ اپنے گھر سے کھانا، پانی، چائے بھی اسے دی۔۔۔ تھی، لیکن اس ماہانہ چندے کے استعمال کے بارے میں صرف آئیں بائیں شائیں ہوتا رہا تھا۔ غلام فرید کو چندے کے صحیح استعمال میں کوئی زیادہ دلچسپی نہیں تھی، اس کے لیے عام حالات میں اتنا ہی کافی ہوتا کہ مولوی صاحب اسے گوشت کھلا رہے تھے، مگر فی الحال مسئلہ یہ تھا کہ غلام فرید اپنے ہاتھ سے ہر مہینے بیس ہزار کی رقم جس مشکل سے مولوی صاحب کو دے رہا تھا، وہ غلام فرید ہی جانتا تھا۔ مگر اسے خوف تھا تو صرف اللہ کا۔۔۔ کہ وہ مسجد کا پیسہ تھا اور وہ اس کا امانت دار بن گیا تھا، مگر اس پیسے کا مولوی صاحب کے ہاتھوں غائب ہونا اس سے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

مولوی صاحب نے اس کے دل سے مسجد کے پیسے کے لیے اللہ کے خوف کو ختم کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ اگر مولوی صاحب چندے کے پیسے کو لوٹ کے مال کی طرح استعمال کر سکتے تھے تو پھر غلام فرید کو بھی حق تھا۔ اس کی بھی ضروریات تھیں۔ وہ بھی مجبور تھا۔ اس کے سر پر تو قرضہ بھی تھا۔ غلام فرید چار مہینے اپنے دل میں یہ ہمت پیدا کرتا رہا کہ وہ مولوی صاحب سے اس سلسلے میں بات کرے۔ اسے بھی اس پیسے کا مسجد میں صحیح استعمال نہیں چاہیے تھا اور نہ ہی اسے مولوی صاحب کے اس مرغ مسلم میں دلچسپی رہ گئی تھی جو وہ اس کی اپنے گھر آمد پر اس کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ اسے ان پیسوں میں سے اپنا حصہ چاہیے تھا۔ وہ رقم آدھی آدھی ہونی چاہیے تھی اور اگر آدھی آدھی نہیں ہو سکتی تھی تو کم از کم پانچ ہزار تو اسے ملنا ہی چاہیے تھا۔ اسکول کے مالک نے پہلے مہینے کے بعد کسی مہینے مسجد میں جا کر مولوی صاحب سے ان چیزوں کو دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی جن پر اس کی رقم خرچ ہوئی تھی۔ مسجد میں صفوں کے بجائے قالین، رنگ روغن اور باتھ روم میں ٹائلز لگوا کر اسے یہ اطمینان ہو گیا تھا۔ کہ اس نے مسجد کو اب بہتر کر دیا تھا اور اس کے ہر ماہ بھیجے گئے پیسوں سے مسجد میں قرآن پاک کی تعلیم کے لیے آنے والے بچوں اور مسجد کے اور دوسرے بنیادی قسم کے اخراجات پورے ہوتے رہیں گے۔

غلام فرید نگران تھا کہ وہ یہ دیکھے کہ مسجد میں آنے والے بچوں کو قرآن پاک، قاعدے اور سپارے مسجد ہی مہیا کرے اور اسی طرح کی دوسری چیزیں غلام فرید کو دوسرے مہینے ہی یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ مسجد میں آنے والے کسی بچے کو مسجد سے کچھ نہیں مل رہا تھا اور اگر کچھ مل رہا تھا تو بالکل مفت تو نہیں مل رہا تھا۔ یہ اس کے اضطراب اور بے چینی کا آغاز تھا اور یہ دونوں کیفیات انتہا پر تب پہنچ گئی تھیں جب چوتھے مہینے مولوی صاحب نے نیا موٹر سائیکل خرید لیا تھا۔

غلام فرید انہیں اگلے مہینے کے پیسے دینے گیا تھا اور ان کی نئی موٹر سائیکل کو دیکھ کر وہ اس قدر حسد اور خفگی کا شکار ہوا تھا کہ وہ ان پیسوں کا ذکر کیے بغیر صرف موٹر سائیکل کی مٹھائی کھا کر آ گیا تھا۔ مولوی صاحب نے ماہانہ چندے کا پوچھا تھا، کیونکہ وہ مہینے کی پہلی تاریخ تھی۔ غلام فرید نے مسجد میں بیٹھ کر اس دن پہلا جھوٹ بولا تھا اور کہا تھا کہ اسکول کا مالک ملک سے باہر چلا گیا ہے اور ابھی واپس نہیں آیا۔ مولوی صاحب کو یک دم فکر ہوئی تھی

کہ اسکول کا مالک فوری طور پر واپس نہ آیا تو پھر اس مہینے کے پیسے کون دے گا؟ غلام فرید کے پاس سوال کا جواب نہیں تھا۔ البتہ اس نے مولوی صاحب کو اسکول کے مالک کا فون نمبر دے دیا تھا' جو غلط تھا۔ مولوی صاحب مطمئن ہو گئے تھے کہ اگر کچھ دن تک وہ چندہ نہ پہنچا تو وہ اسکول کے مالک سے خود بات کریں گے۔

غلام فرید بیس ہزار کی رقم جیب میں لیے اس دن ایک عجیب سی کیفیت کے ساتھ مسجد سے نکلا تھا۔ یوں جیسے اس کی لاٹری نکلی تھی۔ اسے پتا تھا مولوی صاحب ہر سال مختلف چیزوں سے اکٹھی ہونے والی رقم کو اپنی رقم کے طور پر گاؤں کے انہیں سود خوروں کو بزنس میں سرمایہ کاری کرنے کے لیے دیتے تھے جو سود خور غلام فرید جیسے ڈھیروں ضرورت مندوں کو وہ رقم دے کر انہیں ساری عمر کے لیے چوپایہ بنا دیتے تھے۔ مولوی صاحب بظاہر یہ ظاہر کرتے تھے کہ انہیں یہ پتا ہی نہیں کہ وہ جن لوگوں کے بزنس میں مسجد کی رقم کی سرمایہ کاری کر کے ماہانہ ایک فکسڈ رقم وصول کر رہے ہیں ان کا اصلی اور بنیادی بزنس کیا تھا۔ وہ اس ماہانہ فکسڈ رقم کو بھی سود نہیں منافع کہتے تھے' کیونکہ انہوں نے کچھ امیر لوگوں کے منافع بخش بزنس میں شراکت داری کی تھی اور کیونکہ ان لوگوں کو بھی بزنس میں نقصان نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے مولوی صاحب کو بھی نہیں ہوتا تھا۔ مولوی صاحب یہ توجیہہ نہ بھی پیش کرتے تب بھی گاؤں میں کوئی کمی کمین کسی امام مسجد سے جا کر یہ سوال و جواب نہیں کر سکتا تھا کہ وہ مسجد کے پیسے کو اپنی ذاتی رقم ظاہر کر کے کسی سود خور کے بزنس میں کیسے لگا اور اس کا منافع کھا رہے تھے۔

یہ سوال کوئی چندہ دینے والا کرتا تو شاید مولوی صاحب کو قرآن و حدیث میں سے اپنے مطلب کی کوئی چیز رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کرنی پڑ جاتی اور وہ اس میں ماہر تھے۔ دین میں اپنی مرضی کا ردوبدل ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ لیکن اب ان کی بدقسمتی یہ ہوئی تھی کہ سود میں جکڑے ہوئے ایک شخص کو مولوی صاحب کو چندے کی رقم سونپنے کی ذمہ داری دے دی گئی تھی۔

مولوی صاحب نے ایک ڈیڑھ ہفتہ مزید رقم کا انتظار کیا اور پھر کچھ بے صبری میں وہ نمبر گھما دیا جو غلام فرید نے دیا تھا۔ نمبر آف تھا۔ دو دن وقفے وقفے سے کئی بار فون کرنے پر بھی جب وہ نمبر آف ہی ملا تو مولوی صاحب' غلام فرید کے پاس جانے کے بجائے اسکول پہنچ گئے تھے اور وہاں پہنچ کر انہیں یہ خبر مل گئی تھی کہ اسکول کا مالک کئی دن پہلے اسکول سے ہو کر جا چکا تھا۔ مولوی صاحب کا پارہ اب ہائی ہو گیا تھا۔ انہوں نے غلام فرید کو اس کے کوارٹر پر جا لیا تھا اور جب غلام فرید نے انہیں ایک بار پھر پہلے کی طرح یہ کہہ کر ٹرخانے کی کوشش کی کہ مالک ابھی تک نہیں آیا تو مولوی صاحب نے اس کے جھوٹ کی پول کھول دی تھی اور اسے کہا تھا کہ وہ اسکول سے ہو کر آئے ہیں اور وہ جانتے ہیں۔ مالک ہمیشہ کی طرح مہینے کے شروع میں ہو کر جا چکا تھا۔ غلام فرید نے جواباً" مولوی صاحب سے کہا کہ "ہو سکتا ہے وہ آیا ہو' لیکن اس دن غلام فرید کی چھٹی تھی اور اس کی ملاقات مالک سے نہیں ہوئی۔"

مولوی صاحب اس پر کچھ زیادہ بھڑکے تھے اور انہوں نے غلام فرید سے کہا کہ اس نے انہیں مالک کا نمبر بھی غلط دیا ہے وہ اس کو فون کرتے ہیں' مگر وہ نمبر آف ہے اور وہ اب مالک کا نمبر اسکول کی انتظامیہ سے ہی لیں گے اور پھر خود اس سے بات کریں گے۔

غلام فرید کو اب اندازہ ہو گیا کہ وہ مولوی صاحب سے مزید جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ اسے ان سے اب دوٹوک لیکن صاف صاف بات کرنی تھی۔ اور پھر اس نے بالآخر مولوی صاحب کو یہ بتا ہی دیا تھا کہ اسے اس رقم میں سے ہر مہینے اپنا حصہ چاہیے تھا۔ کچھ لمحوں کے لیے مولوی صاحب کو جیسے یقین ہی نہیں آیا تھا کہ گاؤں کا ایک کمی کمین گاؤں کی مسجد کے "امام صاحب" سے کیا مطالبہ کر رہا تھا اور جب انہیں یقین آیا تو ان کے منہ سے جیسے غصے سے جھاگ نکلنے لگا تھا۔ ان کے ساتھ ایسی جسارت پہلی بار کسی نے کی تھی۔

"تم اللہ کے گھر کے لیے ملنے والے ہدیے سے اپنا حصہ مانگ رہے ہو دوزخی انسان!؟"

انہوں نے غلام فرید کو ڈرانے کی کوشش کی تھی۔ انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ غلام فرید دوزخ جیسی زندگی گزارتے گزارتے اب موت کے بعد دوزخ سے کیا ڈرتا۔

"اللہ کے گھر کے پیسے اگر اللہ کے گھر پر لگتے تو کبھی نہ مانگتا مولوی صاحب!" اس نے بھی تن کر ان سے کہہ دیا تھا۔ مولوی صاحب نے جواباً" اسے دھمکایا کہ وہ اسکول کے مالک سے بات کریں گے اور اسے اس کا کچا چٹھا سنا دیں گے۔

جواباً" غلام فرید نے انہیں دھمکایا کہ وہ بھی اسکول کے مالک کو یہ بتا دے گا کہ مولوی صاحب چندے والی رقم کو خود استعمال کر رہے ہیں اور انہوں نے مسجد کے پیسوں کو ایک سود خور کو دے رکھا ہے اور وہ اس کا سود کھا رہے ہیں' بلکہ وہ پورے گاؤں میں انہیں بدنام کرے گا۔ ان کے پول کھول کھول کر۔ مولوی صاحب کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ ان کا بس چلتا تو غلام فرید کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کے سامنے ڈال دیتے۔ انہیں یہ علم ہی نہیں تھا کہ وہ کمینہ ان کے اتنے بڑے راز سے واقف تھا۔ وہ کچھ دیر اسے جی بھر کے برا بھلا کہتے رہے۔

اس دن مولوی صاحب نے غلام فرید کو دنیا بھر کی ہر وہ گالی دے ڈالی جو انہوں نے کبھی کہیں سنی تھی' لیکن غلام فرید ڈھٹائی سے اپنے پیلے دانتوں کے ساتھ منہ کھول کر ان کے سامنے ہنستا رہا۔

"ٹھیک ہے مولوی صاحب مجھے تو کیڑے ہی پڑیں گے' سانپ اور بچھو قبر میں میری لاش نوچیں گے اور مجھے مرتے دم کلمہ بھی نصیب نہیں ہو گا۔ میرے ساتھ جو بھی مرنے کے بعد ہو گا' لیکن آپ کے بیس ہزار تو آپ کی زندگی میں ہی بند ہو جائیں گے۔ اسی مہینے سے۔۔۔ میں مالک کو کہہ دیتا ہوں کہ میں نے اس لیے آپ کو پیسے نہیں دیے' کیونکہ آپ تو مسجد میں پیسے لگا ہی نہیں رہے تو سوچیں زیادہ نقصان دوزخی کا ہوا کہ جنتی کا؟"

غلام فرید نے خود زندگی میں کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس جیسا کمی کمین مسجد کے امام کے ساتھ کبھی اس طرح بات کرے گا۔ لیکن کسی نے ٹھیک کہا ہے۔۔۔ پیسہ بڑی کتی چیز ہوتی ہے۔ اچھے اچھوں کو کتا بنا دیتی ہے۔ بڑے بڑوں کو بھونکنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

سب گالم گلوچ اور لعنت ملامت کے بعد اس دن مولوی صاحب نے واپس گھر پہنچ کر اپنی بیوی سے مشورہ کیا تھا اور پھر اگلے دن بڑے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ مولوی صاحب نے غلام فرید کے ساتھ پندرہ ہزار وصول کرنے پر اتفاق کر لیا تھا اور اس سے بھی بڑی اعلا ظرفی کا مظاہرہ انہیں اس وقت کرنا پڑا' جب غلام فرید نے انہیں بتایا کہ وہ اس مہینے کے بیس ہزار پہلے ہی خرچ کر چکا تھا۔ یہ پچھلے چار مہینوں کے پیسوں سے اس کا کمیشن تھا۔ مولوی صاحب کا دل چاہا وہ غلام فرید نامی اس۔۔۔ کو اپنے ہاتھوں سے گاؤں کے بیچ کھیتوں میں اسی طرح پھانسی پر لٹکا دیں' جس طرح لوگ کھیتوں میں پرندوں کو ڈرانے والے بیجا لٹکاتے ہیں۔ مگر پھر انہیں یاد آیا تھا کہ سال کے آخر میں انہیں اپنی بیٹی کی شادی کرنی تھی اور وہ زمین بھی خریدنی تھی' جس کا بیعانہ وہ کچھ دن پہلے دے کر آئے تھے۔ اس لیے وہ بھی چند گالیوں کے بعد بے حد ٹھنڈے مزاج کے ساتھ وہاں سے چلے گئے تھے۔

غلام فرید کو یقین نہیں آیا تھا کہ بیٹھے بٹھائے اس کو ہر ماہ تنخواہ سے کچھ ہی تھوڑی رقم ملنے لگے گی اور وہ رقم اگر وہ سود والوں کو دیتا رہتا تو بہت جلدی اس کا سب سود ختم ہونے والا تھا۔

غلام فرید کے خوابوں کی گاڑی اس دن پہلی بار دن کے وقت بھی چھکا چھک چلنے لگی تھی۔ مگر اسے اس وقت اندازہ نہیں تھا کہ وہ مولوی صاحب سے دشمنی پال کر اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کر بیٹھا تھا۔ سود لینے سے بھی بڑی غلطی۔

☼ ☼ ☼
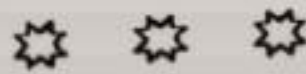
"اے لوگو! عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو۔ تم نے اللہ کو گواہ بنا کران کو خود پر حلال کیا اور انہیں اپنی امان میں لیا ہے۔ تمہیں اپنی عورتوں پر حقوق حاصل ہیں، بالکل ویسے ہی جیسے تمہاری عورتوں کو تم پر حقوق حاصل ہیں۔ ان پر تمہارا یہ حق ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کے ساتھ دوستی نہ کریں، جسے تم پسند نہیں کرتے اور تمہاری حرمت کی نگہبانی کریں اور اگر وہ تمہاری فرماں بردار رہتی ہیں تو پھر یہ ان کا حق ہے کہ تم ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور ان کے نان نفقے کی ذمہ داری اٹھاؤ۔"

☆ ☆ ☆

احسن سعد نے تین سال کی عمر میں اپنی ماں کو اپنے باپ کے ہاتھوں پہلی بار پٹتے دیکھا تھا۔ اس نے کوئی "بے حیائی" کا کام کیا تھا، وہ بے حیائی کا کام کیا تھا، وہ تین سال کی عمر میں جان نہیں سکا تھا لیکن اپنے باپ کی زبان سے بار بار ادا ہونے والا وہ لفظ اس کے ذہن پر نقش ہو گیا تھا۔

اسے یہ بھی یاد تھا کہ اس کے باپ نے اس کی ماں کے چہرے پر دو تھپڑ مارے تھے۔ اس کا بازو مروڑا تھا اور پھر اسے دھکا دے کر زمین پر گرایا تھا۔ اسے وہ چاروں غلیظ گالیاں بھی یاد تھیں جو اس کے باپ نے اس کی ماں کو دی تھیں۔ اپنی ماں کا رونا بھی اور اس پر باپ کا چلانا بھی۔

وہ خوف کے مارے کمرے میں موجود صوفے کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ کیونکہ اسے پہلا خیال یہ آیا تھا کہ اس کا باپ اب اسے پیٹے گا۔ اس کے باپ نے اسے چھپتے دیکھا تھا۔ اس نے شادی کے پانچ سال میں کئی بار اپنی بیوی پر ہاتھ اٹھایا تھا لیکن آج اس دن اس نے پہلی بار اپنی اولاد کے سامنے اپنی بیوی پر ہاتھ اٹھایا تھا۔

مار کٹائی کے اس سین کے فوراً" بعد اس کے باپ نے اسے صوفے کے پیچھے سے بڑے پیار سے پچکارتے ہوئے نکالا تھا۔ پھر وہ اسے گود میں اٹھائے گھر سے باہر لے گیا تھا۔ اگلے دو گھنٹے وہ باپ کے ساتھ اپنی پسند کی جگہوں پر پھرتا اور پسند کی چیزیں کھاتا رہا تھا۔ لیکن اس کا ذہن صرف ان دو تھپڑوں، ایک دو مکے اور چار گالیوں میں پھنسا رہا تھا۔ اور اس کے بعد اس کی ماں کا اس طرح رونا جس طرح وہ کوئی ضد پوری نہ ہونے پر روتا تھا۔

"تم تو میرے پیارے بیٹے ہو۔ سب سے زیادہ پیارے ہو مجھے۔" اس کا باپ اسے ان دو گھنٹوں کے دوران مسلسل بہلاتا پچکارتا رہا تھا۔ وہ باپ کے گلے بھی لگتا رہا، باپ کے کہنے پر اس نے باپ کے چہرے کو چوما بھی اور وہ باپ کی باتوں کا جواب دینے کی بھی کوشش کرتا رہا۔ لیکن وہ اس دن پہلی بار اپنے باپ سے خوف زدہ ہوا تھا۔

دو گھنٹے کے بعد گھر واپسی پر اس نے اپنی ماں کو معمول کے کاموں میں مصروف پایا تھا۔ وہ کھانا پکا رہی تھی۔ جیسے روز پکاتی تھی۔ اس کے باپ کو چائے بنا کر دی تھی۔ جیسے روز دیتی تھی۔ اور اس سے اور اس کی بڑی اور چھوٹی بہن سے بات کرتی رہی تھی جیسے روز کرتی تھی۔ مگر فرق صرف یہ تھا کہ آج اس کے چہرے پر انگلیوں کے چند نشان تھے اور اس کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ اور وہ اس سے آنکھیں نہیں ملا رہی تھی۔ اس دن اس کا دل اپنی ماں کے پاس سونے کو نہیں چاہا۔ اور اس کا دل ان نئے کھلونوں سے کھیلنے کو بھی نہیں چاہا جو اس کے باپ نے اسے دلائے تھے۔ وہ اپنی پانچ سالہ بہن کے بستر میں سونے کے لیے گیا تھا اور بہت دیر تک نہیں سو سکا تھا۔ اس نے کسی بڑے کو کسی دوسرے بڑے کو پہلی بار "مارتے" دیکھا تھا اور اس دوسرے "بڑے" کو کسی مزاحمت کے بغیر مار کھاتے دیکھا تھا۔ یہ بچوں کے جھگڑے میں تو نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنی بہن کے ساتھ لڑتا تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے کو پیٹتے تھے یہ ون سائیڈڈ مقابلہ۔

اگلے چند دن وہ پریشان رہا تھا اور خاموش بھی۔ اس کی ماں نے اس کی خاموشی نوٹس کی یا نہیں، لیکن اس کے باپ نے کی تھی اور وہ اس کی وجہ سے واقف تھا۔ وہ اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھا اور

اب وہ باپ سے ہلکا سا کھنچا تھا تو اس کے لیے اسے نظر انداز کرنا ناممکن تھا۔ اگلے کئی دن اس کا باپ اس پر معمول سے زیادہ توجہ دیتا رہا اس کے زیادہ نخرے اٹھاتا رہا' زیادہ فرمائشیں پوری کرتا رہا۔ وہ آہستہ آہستہ نارمل ہو تا گیا تھا۔ اور وہ پہلی اور آخری بار تھا جب اس کے باپ نے اس کی ماں کو مارنے کے بعد اس کے اتنے نخرے اٹھائے تھے۔ بعد کے سالوں میں اس کی ماں کئی بار اس کے سامنے پٹی تھی۔ (آنسو بہائے بغیر۔ وہ جیسے اب عادی ہو گئی تھی۔) اس نے ان غلیظ گالیوں کو معمول کے الفاظ میں تبدیل ہوتے دیکھا تھا جب بھی اس کے باپ کو غصہ آتا تو وہ ان الفاظ کا بے دریغ استعمال کرتا۔ اور وہ اب صوفے کے پیچھے نہیں چھپتا تھا۔ وہ ایک خاموش تماشائی کی طرح اپنی بہنوں کے ساتھ یہ سارا منظر دیکھا کرتا تھا۔ اور ایسے ہر منظر کے بعد اس کا باپ اسے شام کی سیر کے لیے لے جایا کرتا تھا۔ اور اس سیر کے دوران وہ اسے بتایا کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ بے حیائی کے کاموں کو کتنا ناپسند کرتا ہے اور عورت سب سے زیادہ بے حیائی کے کاموں میں ملوث ہے۔ اور بے حیائی کے کام کرنے والوں کو سزا دینی چاہیے۔

پانچ سال کی عمر میں اسے قرآن پاک کی بہت ساری آیات اس کے باپ نے یاد کروائی تھیں۔ بہت ساری دعائیں بھی۔ اور اس کے ساتھ بے حیائی کے کاموں کی وہ فہرست بھی جس کے کرنے پر کسی عورت کو سزا دینا واجب ہو جاتا تھا اور بے حیائی کے ان کاموں میں شوہر کی نافرمانی' پردے کی پابندی نہ کرنا' کسی نامحرم سے ملنا یا بات کرنا' گھر سے اجازت کے بغیر جانا' کسی قسم کا فیشن یا سنگھار کرنا' شوہر سے اونچی آواز میں بات کرنا' کھانا دیر سے بنانا یا بدمزہ بنانا' ٹی وی دیکھنا' میوزک سننا' نماز روزے کی پابندی نہ کرنا' اس کے دادا دادی کی خدمت نہ کرنا اور بہت سے دوسرے کام تھے جو اسے مکمل طور پر ازبر تھے' کیونکہ بے حیائی کے ان سارے کاموں پر اس نے کبھی نہ کبھی اپنی ماں کو پٹتے دیکھا تھا۔

وہ جن قاری صاحب سے قرآن پاک پڑھتا تھا ان سے ماں باپ کے ادب اور خدمت کے بارے میں قرآنی احکامات بھی سنتا تھا' خاص طور پر ماں کے حوالے سے۔ مگر اس کا ذہن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ عورت جو بے حیائی کے بہت سارے کام کرتی ہے اور اسے سزا ملتی ہے وہ اس کی عزت کیسے کرے۔ آخر کیسے کر سکتا تھا۔ سوال اس کے پاس اور بھی بہت سے تھے' لیکن ان کے جواب ایک پانچ سال بچہ اپنے باپ کے ساتھ واک کرتے ہوئے اور اسلام کے حوالے سے لمبی لمبی تقریریں سنتے ہوئے نہیں پوچھ سکتا تھا۔ آسان تشریح وہی تھی جو اس نے کی تھی۔ وہ بڑا ہو کر مرد بننے والا تھا' ایک ایسا مرد جسے کسی بھی عورت کو بے حیائی کے کاموں سے منع کرنے کے لیے اس پر ہاتھ اٹھانے اور اسے وہ گالیاں دینے کا حق تھا جو اس کا باپ اسے عام زندگی میں اپنے ساتھ کھیلنے یا پڑھنے والے کسی بچے کو دینے سے سختی سے منع کرتا تھا۔ اور اس کا آئیڈیل اس کا باپ تھا۔ باریش داڑھی کے ساتھ اسلامی شعائر پر سختی سے کاربند' پانچ وقت نماز پڑھنے والا ایک بے حد خوش اخلاق' نرم خو' خوش گفتار انسان اور سعادت مند بیٹا۔ جو اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ مغرب میں گزارنے کے باوجود ایک "مثالی" اور "عملی" مسلمان تھا۔ وہ بھی بڑا ہو کر ویسا ہی مثالی اور عملی مسلمان بننا چاہتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اے لوگو تمہارے خون' تمہارے مال ایک دوسرے کے لیے اسی طرح محترم ہیں جیسے آج کا یہ دن (عرفہ کا دن) یہ مہینہ (ذی الحجہ) اور یہ شہر (مکہ)

خبردار زمانہ جاہلیت کی ہر رسم اور طریقہ آج میرے قدموں کے نیچے ہے اور جاہلیت کے خون معاف کر دیے گئے ہیں اور پہلا خون جو میں اپنے خونوں سے معاف کرتا ہوں وہ ابن ربیعہ حارث کا خون ہے۔

دیکھو میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ پھر سے ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔

غلام فرید کی زندگی میں صرف چند اچھے مہینے آئے تھے۔ ایسے مہینے جن میں پہلی بار اس نے راتوں کو سکون سے سونا سیکھا تھا۔ مہینے کے آخر میں سود کی قسط جمع کرانے کے لیے پیسوں کی جمع تفریق کیے بغیر۔ اور وہی چند مہینے تھے، جن میں شادی کے ابتدائی دنوں کے بعد پہلی بار نسیمہ اور غلام فرید نے مل کر کچھ خواب بُنے تھے۔ اچھے دنوں کے خواب جب ان کے سر سے وہ سود ختم ہو جائے گا۔ پانچ ہزار کی وہ اضافی رقم جیسے ایک نعمت مترقبہ تھی ان کے لیے۔ اور وہی کچھ دن تھے جب غلام فرید اور اس کی بیوی نے اپنے بچوں کے بارے میں بھی سوچا تھا کہ وہ جب بڑے ہوں گے تو ان کے سر پر قرض کی وہ تلوار نہیں لٹک رہی ہوگی جو اب لٹک رہی تھی۔

غلام فرید بہت معصوم تھا یا شاید بے وقوف۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ اس نے زندگی میں پہلی بار کوئی بہت بڑی کامیابی حاصل کرلی تھی۔ جیسے ترقی کی طرف پہلا قدم اٹھالیا تھا اس نے۔ وہ پانچ ہزار کی رقم کو پنشن بنا بیٹھا تھا، جو ساری عمر کسی رکاوٹ کے بغیر اسے ملتی رہتی تھی۔

مولوی صاحب کے ساتھ غلام فرید نے جو کچھ کیا تھا اس کے بعد مولوی صاحب کی نیندیں کئی دن اڑی رہی تھیں۔ بیس ہزار کی رقم بیٹھے بٹھائے پندرہ ہزار رہ گئی تھی اس کا صدمہ تو تھا ہی تھا لیکن ساتھ اس بات کا بھی اندیشہ انہیں ہوگیا تھا کہ مسجد کی رقم کو سود خوری کے کاروبار میں لگانے کی خبر اگر گاؤں میں کسی طرح پھیل گئی تو اور کچھ ہو گا یا نہیں انہیں مستقبل میں چندے ملنا بند ہو جائیں گے۔

بدنامی کی تو خیر انہیں زیادہ فکر نہیں تھی۔ بدنامی ہو بھی جاتی تو بھی کوئی انہیں امامت سے اور اس مسجد سے نہیں ہٹا سکتا تھا۔ مسجد انہیں باپ دادا کی جاگیر کی طرح ورثے میں ملی تھی اور گاؤں کے لوگوں کو صحیح طرح سے وضو کرنا تو آتا نہیں تھا۔ وہ امام مسجد کو دینی لحاظ سے کیا جانچتے اور اگر ہٹا بھی دیتے تو ان کی جگہ پر لاتے کس کو۔

بیوی مولوی صاحب کو سودی کاروبار میں لگائی رقم واپس لینے نہیں دے رہی تھی۔ یہ وہ پہلا خیال تھا جو غلام فرید کی دھمکی کے بعد مولوی صاحب کو آیا تھا کہ وہ جتنی جلدی ہو سکے اپنی رقم واپس لے لیں تاکہ کم از کم غلام فرید کی ایسی کسی دھمکی کو سچ ثابت کرنے پر وہ اسے جھوٹا تو ثابت کر دیتے۔

بیوی کا کہنا تھا اور کون سی ایسی جگہ ہے جہاں پیسہ لگانے پر 25 فی صد منافع مل جائے۔ بینک والے تو آٹھ یا نو فی صد بھی رو دھو کر دیتے تھے۔ اور وہ یہ رقم کاروبار سے نکال لیں گے تو اس منافع کی کمی کہاں سے پوری کریں گے۔ بیٹیوں کے جہیز کہاں سے بنیں گے۔ ان کی شادی کے اخراجات کہاں سے پورے ہوں گے۔ مسجد کی امامت سے تو تین وقت کی روٹی ہی پوری ہو سکتی تھی۔ باقی اخراجات کے لیے وہ آمدنی ناکافی تھی۔

مولوی صاحب کو بیوی کی باتیں تو سمجھ میں آ رہی تھیں اور وہ اس کے خدشات سے بھی واقف تھے، لیکن خود اب ان کو شدید دھڑکا لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں کسی دن غلام فرید پندرہ ہزار کی باقی رقم بھی دینے سے انکاری نہ ہو جائے اور ان کا یہ خدشہ بالکل ٹھیک نکلا تھا۔

دو ماہ بعد غلام فرید نے اپنے گھر کے کچھ ناگزیر اخراجات کی وجہ سے مولوی صاحب کو بیس ہزار کی رقم دینے سے معذرت کرلی تھی اور ان سے اگلے ماہ کی مہلت مانگ لی تھی۔ یہ وہ لمحہ تھا جب مولوی صاحب نے گالم گلوچ اور لعنت ملامت نہیں کی تھی اسے۔ انہوں نے اسے جہنم سے ڈرانے کے بجائے اس کی زندگی خود جہنم بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ انہوں نے اپنی بیوی کو بتائے بغیر گاؤں کے اس شخص سے اپنی رقم کا مطالبہ یہ کہہ کر کیا تھا کہ مسجد کی تزئین و آرائش کے لیے فوری طور پر ایک بڑی رقم چاہیے، اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ اپنی رقم نکال کر اس میں سے کچھ مسجد میں چندہ کر دیں۔ جو جواب انہیں ملا تھا، وہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

اس آدمی نے انہیں رقم واپس کرنے سے صاف انکار کردیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ فی الحال رقم کاروبار میں لگی ہوئی ہے اور وہ اگلے دو تین سال تک اس کا منافع تو دے سکتا ہے لیکن اصل رقم واپس نہیں کرسکتا۔ مولوی صاحب کو وہاں کھڑے کھڑے دن میں تارے نظر آگئے تھے۔ انہوں نے پانچ لاکھ کی رقم اس آدمی کو دی ہوئی تھی، اور وہ کچھ کمیشن وغیرہ کٹوانے کے بعد تقریباً "ستر' اسی ہزار روپیہ ہر ماہ وصول کررہے تھے اور اب ایک دم اس آدمی کے انکار نے ان کے چودہ طبق روشن کردیے تھے۔

وہ پچھلے کئی سالوں سے اس آدمی کے پاس یہ سرمایہ کاری کررہے تھے شروع میں دس بیس ہزار سے شروع ہونے والا یہ بزنس آہستہ آہستہ پانچ لاکھ رقم تک چلا گیا تھا۔ اور اب وہ آدمی کہہ رہا تھا کہ وہ اصل رقم نہیں دے سکتا تھا' صرف سود دے سکتا تھا۔

اس دن غلام فرید سے مولوی صاحب کی نفرت کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ گھر جاکر انہوں نے بیوی کو یہ قصہ بھی سنایا تھا' وہ بھی ان ہی کی طرح دل تھام کے رہ گئی تھی۔ مگر پھر اس نے مولوی صاحب کو یہ کہتے ہوئے تسلی دی۔

"چلیں مولوی صاحب دو تین سال بعد ہی دے گا مگر دے تو دے گا نا۔ اور شکر ہے اس نے منافع دینے سے انکار نہیں کیا۔ میں تو پہلے ہی آپ کو روک رہی تھی۔ کہ ابھی اپنی رقم واپس لینے کی ضرورت نہیں ہے' لیکن پتا نہیں آپ کو کیا سوجھی تھی کہ لگی لگائی روزی پر لات مارنے چل پڑے۔" اسے مولوی صاحب سے یہ بات کہتے ہوئے یہ پتا نہیں تھا کہ وہ لگی لگائی روزی خود ہی انہیں لات ماردینے والی تھی۔

اگلے مہینے ایک بار پھر مولوی صاحب کو غلام فرید سے پیسے نہیں ملے اور اس مہینے انہیں اس ساہوکار نے منافع کی رقم بھی نہیں دی۔ ایک ماہ پہلے مولوی صاحب کے رقم کے مطالبے نے جیسے اسے چوکنا کردیا تھا کہ وہ پارٹی ٹوٹنے والی تھی اور جب وہ پارٹی ٹوٹنے والی تھی تو وہ اس کو منہ بھر بھر کے منافع کیوں کھلاتا۔ اب اس کی باری تھی' دیا گیا سارا منافع واپس وصول کرنے کی۔ لیکن اس نے مولوی صاحب سے یہ باتیں نہیں کی تھیں' اس نے مولوی صاحب سے بس فی الحال چھ ماہ کی مہلت مانگی تھی اور یہ کہا تھا کہ چھ ماہ کے بعد وہ چھ ماہ کا منافع اکٹھا انہیں لوٹا دے گا لیکن فی الحال اس پر شدید مالی بحران آیا تھا اور اس نے مولوی صاحب سے نہ صرف دعا کی درخواست کی تھی بلکہ کوئی قرآنی وظیفہ بھی مانگا تھا اپنے کاروبار میں برکت کے لیے۔

مولوی صاحب کو ٹھنڈے پسینے آگئے تھے اس کی باتیں سن کر۔ اور کچھ بعید نہیں تھا کہ ہارٹ فیل ہی ہوجاتا ان کا۔ وہ پل بھر میں لکھ پتی سے ککھ پتی ہوئے تھے۔ اور وہ بھی دن دہاڑے۔ یہ غلام فرید نہیں تھا۔ گاؤں کا کمی کمین جسے وہ اس کے دروازے پر منہ بھر بھر کر گالیاں دیتے رہتے اور وہ ڈھیٹوں کی طرح دانت نکال کر ہنستا رہتا۔ یہ گاؤں کا "ساہوکار" تھا۔ ایک بزنس مین۔ جو مالی بحران کے باوجود شان دار گھر میں بیٹھا تھا اور اس کے آگے پیچھے نوکر پھر رہے تھے۔ مولوی صاحب چوں بھی کرتے تو وہ انہیں اٹھوا کر گھر سے باہر پھنکوا دیتا اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ وہ گاؤں کی مسجد کے امام صاحب تھے۔

مولوی صاحب چپ چاپ وہاں سے تو اٹھ کر آگئے تھے' لیکن انہوں نے اپنے اس مالی نقصان کا سارا کا سارا غصہ غلام فرید پر اتارا تھا۔ وہی تھا جو ان کی تباہی کا ذمہ دار تھا تو اب ضروری تھا کہ وہ بھی تباہ و برباد ہوتا۔

انہوں نے اسکول سے اس کے مالک کا نمبر لیا تھا اور پھر اسے فون کرکے غلام فرید کے اوپر جی بھر کے الزامات لگائے تھے۔ مالک کا ردعمل فوری تھا اور متوقع تھی۔ وہ پہلی فرصت میں گاؤں آیا تھا اور مولوی صاحب سے ملاقات کے بعد غلام فرید کی صفائیاں اور وضاحتیں' معافیاں سننے کے باوجود اس نے اسے نوکری سے فارغ کردیا تھا۔

غلام فرید کے سر پر جیسے پہاڑ آگرا تھا۔ صرف اسے نوکری سے فارغ نہیں کیا گیا تھا' اس کی بیوی کو بھی نوکری

سے نکال دیا گیا تھا اور ان سے کوارٹر بھی خالی کروالیا گیا تھا۔

گیارہ لوگوں کا وہ خاندان چھت سے بے چھت ہو گیا تھا۔ وسائل اتنے نہیں تھے کہ وہ گاؤں میں بھی کوئی جگہ کرائے پر لے سکتے۔ شاید لے ہی لیتے اگر انہیں زندگی کی گاڑی کے ساتھ قرضے کی ریل گاڑی نہ کھینچنی پڑتی۔ وہ گاؤں تھا، وہاں نوکریاں نہیں ملتی تھیں۔ لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے یا اپنا کاروبار یا پھر محنت مزدوری۔

غلام فرید اور اس کی بیوی کو لوگ خوش قسمت سمجھتے تھے کہ ان پڑھ ہونے کے باوجود انہیں ایک اسکول میں اتنے اچھے پیسوں پر کام بھی ملا ہوا تھا اور کوارٹر بھی۔ مگر اس گاؤں میں اور ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں پر کام کرنا خوش قسمتی قرار پاتا۔ مولوی صاحب کے طفیل غلام فرید پورے گاؤں میں اپنی بیوی سمیت بدنام ہو چکا تھا۔ وہ ایک چور تھا جس نے اللہ کے پیسوں کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔ گاؤں والوں نے مولوی صاحب کے بار بار دہرائے گئے قصے سن سن کر غلام فرید کا جیسے سوشل بائیکاٹ ہی کر دیا تھا۔ غلام فرید نے بھی مولوی صاحب کے کارنامے لوگوں کو بتانے کی کوشش کی تھی لیکن کسی نے ایک کمی کمین چور پر یقین نہیں کیا تھا۔ یقین کرتے بھی کیسے وہ "مولوی صاحب" پر الزام لگا رہا تھا۔ "مولوی صاحب" پر۔ اور وہ بھی غبن اور بددیانتی کے الزام میں بیوی سمیت نوکری سے نکالے جانے کے بعد۔ مولوی صاحب بری الذمہ اور معصوم قرار پائے تھے۔

پتا نہیں وہ کون سا لمحہ تھا جب غلام فرید نے اپنا ذہنی توازن کھونا شروع کیا تھا۔ بھوک اور تنگ دستی نے اس کا دماغ خراب کیا تھا۔ گاؤں والوں کی باتوں اور طعنوں نے۔ لڑکپن میں داخل ہوتی بیٹیوں پر پڑتی گاؤں کے لڑکوں کی گندی نظروں اور اپنی بے بسی نے۔ یا پھر ان سود خوروں کی دھمکیوں اور چکروں نے جو غلام فرید کو سود کی قسطیں ادا کرنے کے قابل نہ رہنے پر بار بار اس احاطے کے ٹوٹے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر مار پیٹ کرتے جہاں جانوروں کے ایک باڑے کے برابر غلام فرید نے بھی لکڑی کی چھت ڈال کر وقتی طور پر اپنے خاندان کو پناہ دی تھی۔

پتا نہیں کیا ہوا تھا غلام فرید کو۔ اور یہ واقعی پتا نہیں چلتا کہ انسانوں کو ہوتا کیا ہے جب وہ اپنے خونی رشتوں کو اپنے ہی ہاتھ سے ختم کر دیتے ہیں۔

چنی ایک سال کی تھی جب غلام فرید نے ایک رات اپنے خاندان کے نو کے نو افراد کو ذبح کر دیا تھا۔ چنی واحد تھی جو بچ گئی تھی اور وہ بھی شاید اس لیے بچ گئی تھی کیونکہ پاگل پن کے اس لمحے میں غلام فرید اپنی اولاد کی گنتی ہی بھول گیا تھا۔ چنی کو کبھی اس نے گود میں اٹھا کر دیکھا نہیں تھا تو وہ اسے یاد آتی بھی تو کیسے۔ پھر اس پر بھی اپنے بہن بھائیوں کا اتنا خون لگ گیا تھا کہ ان کے برابر بے سدھ سوئے ہوئے بھی غلام فرید کو وہ مری ہوئی ہی لگی ہو گی۔

نو انسانوں کو مارنے کے بعد غلام فرید نے اپنی جان نہیں لی تھی۔ وہ زندہ تھا ہی کب۔ زندہ تو انسان عزت نفس کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جو غلام فرید کی کب کی چھن چکی تھی۔ خاندان کو مار دینا جیسے وہ حل تھا جو ایک ان پڑھ شخص نے غربت اور قرض سے نجات کے لیے نکالا تھا جب کوئی حل ہی باقی نہیں رہا تھا۔

ایک سال کی چنی کو کچھ یاد نہیں تھا۔ نہ قاتل نہ مقتول۔ اس کو یاد تھا تو بس ایک چہرہ جو اسے وہاں سے لے گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اے لوگو! نہ تو میرے بعد کوئی نیا پیغمبر یا نبی آئے گا نہ تمہارے بعد کوئی نئی امت ہیں تمہارے پاس اللہ کی کتاب اور اپنی سنت چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اگر تم ان پر عمل کرو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔"

☆ ☆ ☆
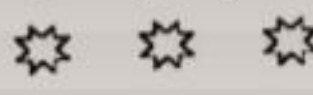
وہ رات ہاشم مبین کی زندگی کی مشکل ترین راتوں میں سے ایک تھی۔ صرف انہیں کی نہیں کسی بھی باپ کے

لیے مشکل ترین ہوتی' انہیں لگ رہا تھا' انہوں نے ایک بھیانک خواب دیکھا تھا کچھ دیر پہلے۔ مگر خواب انسان جاگتی آنکھوں سے کیسے دیکھ سکتا ہے اور خواب میں بھی انسان کی اپنی اولاد اپنے والدین کے ساتھ ایسی بے رحمی کا سلوک کیسے کر سکتی ہے کہ انسان ایک لمحے کے لیے اس کے اپنی سگی اولاد ہونے پر شبہ کرے۔

وہ اپنی اسٹڈی میں بیٹھے اپنی جائیداد اور بینک اکاؤنٹس اور دوسرے اثاثہ جات کی فائلز اپنے سامنے میز پر ڈھیر لیے صرف یہ سوچ رہے تھے کہ یہ سب ان کے ساتھ کیوں ہو رہا تھا انہوں نے تو اپنی اولاد کو ہمیشہ "حلال" کھلایا تھا۔ پھر ایسی کون سی غلطی یا گناہ ہوا تھا کہ وہ آج وہاں کھڑے تھے۔

اولاد ماں باپ کے مرنے کے بعد ترکہ پر لڑے تو سمجھ میں آتا ہے مگر اولاد ماں باپ کی زندگی میں ہی ان کے سامنے اسی طرح جائیداد کے حصوں اور پائی پائی پر لڑے جیسے ماں باپ مر گئے ہوں تو ماں باپ کو کون سی صلیب پر چڑھنا پڑتا ہے۔ ہاشم مبین آج کل اسی صلیب پر چڑھے ہوئے تھے۔

بڑھاپا بڑی ظالم چیز ہوتا ہے۔ اور تخت پر بیٹھے بوڑھے بادشاہ کو تخت پر بیٹھے ہوئے اپنا ولی عہد بھی اچھا نہیں لگتا' اپنی اولاد سے بھی خوف آتا ہے اسے۔ ہاشم مبین نے بھی ساری زندگی ایک بادشاہ ہی کی طرح گزاری تھی۔ وہ سب پر حاوی رہے تھے اور ان کی کسی بھی اولاد کی یہ مجال نہیں تھی کہ وہ ہاشم مبین کے سامنے سر بھی اٹھا سکے۔ اور اب اسی ہاشم مبین پر وہی فرماں بردار اولاد انگلیاں بھی اٹھا رہی تھی اور گستاخانہ باتیں بھی کر رہی تھی۔ انہوں نے ساری زندگی اس اولاد کو ایک بہترین لائف اسٹائل دینے کے لیے بہت سارے سمجھوتے کیے تھے۔ اور سمجھوتے کرتے ہوئے وہ صحیح اور غلط کی تمیز ہی بھول گئے تھے۔ آج بیٹھے تھے تو سب کچھ یاد آ رہا تھا پوری زندگی جیسے ایک فلم کی طرح ان کے سامنے چل رہی تھی۔ زندگی میں کب کب انہوں نے ضمیر کا سودا کیا تھا وہ بھی یاد آ رہا تھا کب کب انسانیت کا اور کب اپنے مذہب کا۔

وہ بے چین ہو کر اٹھ کر کمرے میں پھرنے لگے۔ مال و زر کا وہ ڈھیر جو انہوں نے اپنا مذہب بیچ اور بدل کر اکٹھا کیا تھا وہ شاید اسی قابل تھا کہ ان کی اپنی اولاد ہی اسے لوٹ لیتی۔

وہ کھڑکی کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ پچھتاوے کی ایک اسٹیج وہ ہوتی ہے جب انسان پچھتاوا نام کا لفظ بھی نہیں سننا چاہتا۔ یہ اسے گالی کی طرح لگتا ہے۔ انہیں بھی لگ رہا تھا۔ پچھتاوا کیسا؟ ایسا کیا ہی کیا تھا جس پر پچھتاوا ہوتا۔؟ جو بھی کیا تھا سوچ سمجھ کر ہی کیا تھا غلطی کہاں ہوئی۔؟ ساری زندگی بہترین آسائشوں میں گزری' اگر کچھ غلط ہوتا تو کہیں تو ٹھوکر لگتی۔؟ وہ ایک کے بعد ایک سوال سے جیسے اپنی زندگی غلطیوں اور گناہوں کی چھان پھٹک کر رہے تھے۔ چیک لسٹ میں اپنی ٹھوکریں نظر انداز کر کے خود کو درست قرار دے رہے تھے آنکھیں بند کیے۔

اور پھر زندگی کے اس لمحے پر انہیں ایک غلطی اور اس ایک غلطی کے ساتھ امامہ یاد آئی تھی۔ انہوں نے اسے ذہن سے جھٹکا۔ پھر جھٹکا پھر جھٹکا۔ اور پھر وہ رک گئے۔ فائدہ کیا تھا اس کوشش کا۔ پہلے کبھی اس میں کامیاب ہوئے تھے جو آج ہو جاتے۔

کتنے سال ہوئے تھے انہیں اسے دیکھے۔ اس سے ملے۔ آخری بار۔ آخری بار انہوں نے اسے اس ہوٹل میں دیکھا تھا سالار کے ساتھ۔ اور آخری بار انہوں نے اس کی آواز کب سنی تھی۔ اس سے کب بات کی تھی۔؟۔ انہیں یہ بھی یاد تھا۔ یہ کیسے بھول جاتا؟۔ وسیم کی موت پر۔

کتنے سال۔۔۔ کتنے سال گزر گئے تھے۔ انہوں نے ایک گہرا سانس لیا۔ آنکھوں میں آنے والی نمی صاف کی۔ پتا نہیں یہ نمی کس کے لیے آئی تھی وسیم کے لیے۔؟ یا امامہ کے لیے۔؟

آنے والے ہفتے میں سب کچھ بکنا اور بٹنا تھا۔ یہ گھر۔ فیکٹری۔ زمین۔ پلاٹ' اکاؤنٹس میں پڑا پیسہ۔ گاڑیاں۔

سب اثاثے۔ اگر کچھ بٹنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ تو وہ ہاشم مبین اور ان کی بیوی تھیں، جنہیں کوئی بھی اثاثہ نہیں سمجھ رہا تھا اور کوئی بھی ساتھ رکھنے پر تیار نہیں تھا۔ وہ اکیلے رہ سکتے تھے۔ امامہ کے بعد بھی رہے تھے۔ اور وسیم کے بعد بھی رہ رہے تھے۔ نوکر رکھ سکتے تھے اپنے لیے۔ بڑا گھر نہ سہی کوئی چھوٹا گھر لے سکتے تھے، جائیداد کی تقسیم کے بعد ان کے اور ان کی بیوی کے حصے میں اتنا کچھ تو ضرور آجاتا۔ لیکن پریشانی اب پیسے کی نہیں تھی زندگی کی تھی۔ آخر زندگی اتنی لمبی کیوں ہو جاتی ہے؟۔ انسان بڑھاپے کی سیڑھی پر قدم رکھے یہ سب دیکھ کر اور سہ کر ہی کیوں مرتا ہے۔ پہلے ہی کیوں نہیں مر جاتا۔ ہاشم مبین نے اس وقت، جو سوچا تھا۔ وہ کبھی پہلے نہیں سوچا تھا۔

صدمہ یہ نہیں تھا کہ اپنا سب کچھ اولاد کو سونپ کر، ہاتھ جھاڑ کر الگ ہونا تھا۔ اور ان میں بیٹے اور بیٹیاں سب شامل تھے۔ صدمہ یہ تھا کہ یہ تقسیم ایسے ہو رہی تھی.... اس ذلت آمیز انداز میں۔

یہ وہی رات تھی جب انہوں نے ایک بار امامہ سے ملنے کا سوچا تھا۔ یہ وہی رات تھی جب انہوں نے سوچا تھا، کہ شاید انہیں باقی اولادوں کی طرح امامہ کو بھی اپنی جائیداد میں سے حصہ دینا چاہیے۔ اور وہ یہ جانتے تھے وہ اس سوچ پر عمل کبھی نہیں کر سکتے۔ وہ امامہ کو اپنی جائیداد کا وارث نہیں بنا سکتے تھے، کیونکہ اس کے لیے انہیں نے بہت سارے اعتراف کرنے پڑتے۔ عمر کے اس حصے میں ہاشم مبین نے پہلی دفعہ یہ بھی سوچا کہ وہ کچھ اعتراف کر لیں۔ شاید ضمیر کا کچھ بوجھ کم ہو جائے۔ گناہ کا بوجھ گھٹانا تو اب ممکن نہیں رہا تھا۔

✡ ✡ ✡
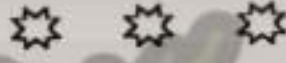
"اور شیطان سے خبردار رہو۔ وہ اس بات سے مایوس ہو چکا ہے کہ اس زمین پر اس کی پرستش کی جائے گی لیکن وہ اس بات پر راضی ہے کہ تمہارے درمیان فتنہ و فساد پیدا کرتا رہے اس لیے تم اس سے اپنے دین و ایمان کی حفاظت کرو۔"

✡ ✡ ✡
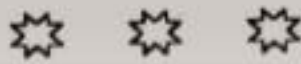
مویشیوں کے اس احاطے میں اپنے خاندان کی لاشوں کے پاس چند گھنٹے بیٹھے رہنے کے بعد غلام فرید اس رات پہلی بار جا کر جانوروں کے باڑے میں سویا تھا۔ زمین پر پڑی پرالی جو جانوروں کے بول و براز سے اٹی ہوئی تھی۔ اس پر گائے بھینسوں کے قریب۔ اسے جس آدمی نے اس احاطے میں خاندان سمیت رہائش دی تھی اس آدمی نے جانوروں کی چوکیداری اور دیکھ بھال کے کام کے عوض دی تھی۔ اور غلام فرید اب ان کی چوکیداری کر رہا تھا۔ یا پھر شاید وہ بھی ایک جانور تھا جسے جانوروں کے ساتھ ہی رہنا چاہیے تھا۔

اس کے خاندان کی لاشیں صبح سویرے دودھ لینے والے کچھ لوگوں نے دیکھی تھیں اور اس کے بعد گاؤں میں کہرام مچ گیا تھا۔ غلام فرید اس کہرام کے دوران بھی جانوروں کے باڑے میں ہی وہ چھری پاس رکھے بیٹھا اسے گھور رہا تھا۔ جو آلہ قتل تھی۔ مگر غلام فرید کی نظر میں وہ آلہ رہائی تھی۔

پورا گاؤں اس احاطے میں آگیا تو لوگوں نے غلام فرید کو بھی دیکھ لیا۔ اس کے کپڑوں اور ہاتھوں پر لگے خون کو بھی۔ اور اس خون آلود چھری کو بھی۔ وہ پہلا موقع تھا جب گاؤں میں سے کوئی غلام فرید کو گالی نہیں دے سکا تھا۔ ہمیشہ کی طرح۔ وہ اس سے دہشت زدہ ہو گئے تھے۔ اس کے قریب تک آنے کی جرات بھی نہیں کر پائے تھے۔ بس گم صم اس کو دور دور سے دیکھ کر یوں سرگوشیاں کر رہے تھے، جیسے وہ چڑیا گھر میں رکھا ہوا پنجرے میں بند کوئی جنگلی جانور ہو جو کسی بھی وقت ان میں سے کسی پر بھی حملہ کر سکتا تھا۔ بس فرق یہ تھا کہ وہ پنجرے کی سلاخوں کے پیچھے نہیں تھا اس لیے زیادہ خطرناک تھا۔

اس دن پوری زندگی میں پہلی بار گاؤں میں سے کسی نے غلام فرید کو ماں، بہن، بیوی بیٹی کی کوئی فحش گالی دے کر

مخاطب کیا تھا نہ ہی کسی نے اس کے ذات کے کی کمین ہونے کو کسی طعنے میں جتایا تھا۔ نہ کسی نے اس پر لعنت ملامت کی تھی نہ گالم گلوچ۔ نہ ڈرایا دھمکایا تھا۔ نہ گریبان سے پکڑا تھا نہ تھوکا تھا نہ ہاتھ اٹھایا تھا۔ اور نہ ہی یہ یاد کرایا تھا کہ اسے سود کی قسط ادا کرنی ہے اس تاریخ تک اور اگر ادا نہ کی تو اس کے ٹکڑے کرنے کے بعد اس کی بیوی اور بیٹیوں کے ساتھ کیا کیا جائے گا۔

زندگی میں پہلی بار اس دن غلام فرید نے جیسے چند لمحوں کے لیے جانور بننے کے بعد انسان جیسا درجہ حاصل کیا تھا۔

پولیس کے آنے سے کچھ دیر پہلے مولوی صاحب بھی موقع واردات پر پہنچ گئے تھے۔ وہ رستے میں سن چکے تھے' کہ غلام فرید نے کیا کیا تھا لیکن اس کے باوجود نو لاشوں اور ان نو لاشوں کے درمیان بلکتی ایک بچی نے ان پر چند لمحوں کے لیے لرزہ طاری کر دیا تھا ؟ نہیں لگا تھا جیسے غلام فرید کو اللہ نے اس کے کیے کی سزا دی تھی۔ اس برائی کی جو اس نے مولوی صاحب کے ساتھ کی تھی اور یہ بات وہ اگلے کئی مہینے وقتاً" فوقتاً" جمعے کے خطبے میں دہراتے بھی رہے۔ اپنی مومنیت رجسٹر کروانے کا اس سے اچھا موقع کہاں مل سکتا تھا مولوی صاحب کو۔ کم علم' جاہل لوگوں کے دل پر اللہ اور مولوی صاحب کی ہیبت قائم کرنے کی۔

پولیس کے پہنچنے پر مولوی صاحب نے ہی اس کا استقبال کیا تھا اور وہ "شیطان" دکھایا تھا جو پھانسی کا حق دار تھا۔ اس "شیطان" نے کسی مزاحمت کے بغیر اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔

"ہاں میں نے ہی مارا ہے سب کو۔ اور صرف اس لیے کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا وہ ویسی زندگی گزاریں جو غلام فرید جی رہا تھا۔ میں کچھ بھی کر لیتا کسی جائز طریقے سے اپنا قرض نہیں اتار سکتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا وہ بھی کینچوؤں کی طرح جئیں۔" غلام فرید نے پولیس کے سامنے اپنے اعترافی بیان میں کہا تھا۔

غلام فرید نے ٹھیک کہا تھا' وہ کسی بھی حلال طریقے کی آمدنی سے سود جیسی حرام چیز کو اپنے سر سے نہیں ہٹا سکتا تھا۔ اس حرام چیز سے نجات کے لیے کوئی اس سے بھی زیادہ حرام کام کرنا تھا اسے۔ اور وہ حرام کام اس نے کر ہی لیا تھا۔

حلال برکت پیدا کرتا ہے... حرام بدی کو جنم دیتا ہے۔

☼ ☼ ☼

"جان جاؤ کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور تمام مسلمان ایک امت ہیں۔ کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے کچھ لے۔ سوائے اس کے جسے اس کا بھائی رضامندی اور خوشی سے دے۔ اور اپنے نفس پر اور دوسرے پر زیادتی نہ کرو۔"

☼ ☼ ☼

بھوک سے روتی بلکتی اور خون میں لتھڑی ہوئی چنی کو سب سے پہلے جس نے دیکھا تھا اس نے اسے بھی زخمی سمجھا تھا لیکن جب اس کی مدد کرنے اور اسے طبی امداد دینے کے لیے اٹھایا گیا تو یہ پتا چل گیا تھا کہ وہ صحیح سلامت تھی۔ گاؤں والوں کے لیے یہ ایک معجزہ تھا کہ اتنی لاشوں میں ایک بچی زندہ رہ گئی تھی۔ غلام فرید کی بے رحمی اور اگل پن کے باوجود۔ گاؤں والوں کے لیے معجزوں کی تشریح بس وہی تھی۔

غلام فرید کا کوئی بھائی نہیں تھا اور بہنوں میں سے صرف ایک اس بات پر تیار ہوئی تھی کہ وہ چنی کو اپنے پاس رکھے گی۔ نسیمہ کے خاندان میں سے کوئی بھی اس پر تیار نہیں ہوا تھا کہ وہ ایک قاتل باپ کی بیٹی کو اپنے گھر لیں۔ لیکن فوری طور پر چنی کی دیکھ بھال صلہ رحمی کے جذبے کے تحت ان کے ایک پرانے ہمسائے نے کرنا

شروع کی تھی۔ چنی کو پیدائش کے بعد زندگی میں پہلی بار پیٹ بھر کر خوراک اور اچھے صاف ستھرے کپڑے اور بس اس دن نصیب ہوا تھا جس دن اس کا خاندان قتل ہوا تھا۔ وہ چنی جس کو کبھی ماں باپ نے بھی غور سے نہیں دیکھا تھا اُسے دیکھنے کے لیے پورا گاؤں امڈ آیا تھا اس کے دودھیالی اور ننھیالی خاندانوں کے سوا۔ جنہیں یہ خدشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو۔ وہ ذمہ داری انہیں کے گلے پڑ جائے۔ غربت اتنی بڑی لعنت ہوتی ہے کہ وہ انسان کے اندر سے خونی رشتوں کی محبت اور انسانیت کی بنیادی صفات بھی نکال دیتی ہے۔ چنی کے دودھیالی اور ننھیالی خاندانوں کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ وہ سب چھوٹی موٹی مزدوریاں کرتے اور بڑے بڑے خاندانوں کو پال رہے تھے۔ چھ' آٹھ بچوں والے خاندان میں ایک اور بچہ اور وہ بھی کسی دوسرے کا پالنا بہت مشکل تھا۔ وسائل اور آمدنی کے محدود ہونے کی وجہ سے۔

صرف غلام فرید کی ایک بہن تھی جس کے صرف چار بچے تھے۔ اور ان میں سے بھی تین بیٹے' تو دونوں خاندانوں کا دباؤ اسی پر پڑا تھا کہ چونکہ اس کی ذمہ داریاں کم ہیں اس لیے چنی کو وہی رکھے۔ صدمے اور غم سے بے حالی کی کیفیت میں وہ اپنے اکلوتے بھائی کے خاندان کی آخری نشانی کو اپنے پاس رکھنے پر تیار تو ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے شوہر اور سسرال والوں نے اس کا وہ صدمہ اس حادثے کے دوسرے ہی دن اپنے تیوروں اور ناراضی سے ختم کر دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ بھی باقی رشتہ داروں کی طرح چنی کی ذمہ داری سے ہاتھ اٹھاتی۔ اس علاقے میں انتظامی عہدے داران اور سیاست دانوں اور سماجی شخصیات کی آمد شروع ہو گئی تھی اور جو بھی آرہا تھا وہ چنی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے ساتھ کچھ نہ کچھ مالی امداد بھی کر کے جا رہا تھا۔

مالی امداد کے لیے دیے جانے والے چیکوں اور کیش رقومات کے سلسلے نے ایک دم چنی کے رشتہ داروں کے اندر صلہ رحمی اور خونی رشتوں کی چاہ جگا دی تھی۔ چنی بوجھ نہیں تھی بلکہ بوجھ بٹانے والی تھی اس کا اندازہ سب ہی کو ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی چنی کی کفالت کے لیے جھگڑوں کا آغاز بھی ہو گیا۔

دونوں سائیڈوں سے پورے کے پورے خاندان والے چنی کی دیکھ بھال کرنے والے اس ہمسائے کے گھر میں دھرنا دے کر بیٹھ گئے تھے۔ آپس میں گالم گلوچ اور مار کٹائی تک نوبت آنے پر ہمسائے کو پولیس کو طلب کرنا پڑا اور پولیس نے اس بچی کو اسی ہمسائے کی کفالت میں دیتے ہوئے فریقین سے کہا کہ وہ چنی کی کسٹڈی کے لیے عدالت سے رابطہ کریں اور جب تک عدالت کوئی فیصلہ نہیں کرتی' وہ بچی اسی گھر میں رہے گی۔

وہ چنی کی زندگی کے اچھے دنوں کا آغاز تھا۔ ہمسائے نے اگرچہ چنی پر وقتی طور پر رحم کھا کر ہی اس کی دیکھ بھال کا ذمہ اٹھایا تھا لیکن چنی کو ملنے والی چھوٹی بڑی نقد رقومات جیسے اس کے لیے لاٹری لگنے کے مصداق ہو گئی تھیں۔ چنی کو حکومتی ذرائع سے ملنے والے چیکس کو کیش کرانے پر تو عدالت نے اس کے رشتہ داروں کی طرف سے درج کرانے والے کیس کی وجہ سے حکم امتناعی دے کر روک دیا تھا مگر کیش رقومات کا حساب کتاب رکھنا اور ان پر کوئی پابندی مکمل طور پر لگانا ناممکن تھا۔

چنی کو اپنے پاس رکھنے والے ہمسائے نے اس کے لیے ملنے والی نقد رقومات کو چنی پر خرچ کرنے کے بہانے کھل کر خرچ کرنا شروع کر دیا۔ وہ جیسے ایک بہتی گنگا تھی جس سے ہر کوئی ہاتھ دھو رہا تھا۔ اس رقم کے ثمرات چنی تک بھی خوراک' کپڑوں' کھلونوں اور طبی سہولیات کی شکل میں پہنچ رہے تھے مگر وہ بہت معمولی تھے ان ثمرات کے مقابلے میں جو اس ہمسائے کے خاندان کو ملنا شروع ہو گئے تھے۔

کیش رقوم کا وہ سلسلہ بہت جلد ہی ختم ہو گیا تھا۔ ایک ڈیڑھ مہینہ میں۔ لوگوں کے دلوں میں پیدا ہونے والی ہمدردیاں ان کی یادداشت کے ساتھ ساتھ کم ہوتی گئیں اور پھر ایک وقت آیا تھا جب چنی ہمسایوں کے لیے ایک بوجھ بن گئی تھی۔ سرکاری امداد کا وہ چیک جس کو استعمال کرنے پر فی الحال پابندی تھی اور وہ صرف اس کو مل سکتا تھا

جسے چنی کی کسٹڈی ملتی۔ اور چنی کی کسٹڈی رشتہ داروں ہی میں سے کسی کو ملنا تھی۔ ہمسائے کو نہیں۔ سو اس سے پہلے کہ عدالت کیس کا فیصلہ کرتی۔ ہمسائے چنی کے سب سے بڑے ماموں کو کچھ رقم کے عوض چنی تھما گئے تھے اور ساتھ انہوں نے عدالت میں یہ بیان بھی دے دیا تھا کہ چنی اسی ماموں کے گھر سب سے زیادہ اچھی پرورش پا سکتی تھی۔

تین مہینے کے بعد باقی تمام رشتہ داروں کی آہ و بکا کے باوجود چنی کا وہ ماموں چنی کی کسٹڈی اور دس لاکھ روپے کی رقم کا چیک عدالت سے حاصل ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ سونے کی چڑیا اب ماموں کے سر پر بیٹھ گئی تھی جو اس سے پہلے ایک ' ریڑھا چلا کر پھل سبزیاں ادھر سے ادھر ڈھوتا تھا' دس لاکھ روپے سے اس نے فوری طور پر زمین کا ایک ٹکڑا خرید کر کاشت کاری کا آغاز کر دیا تھا۔ چنی اس کے گھر میں اس کے سات بچوں کے ساتھ احسان کے طور پر پلنے لگی تھی۔ مگر یہاں اس کی اس طرح کی ناز برداری نہیں کی گئی تھی جو وقتی طور پر ہی سہی لیکن اس ہمسائے نے کی تھی۔

ماموں کے بچوں نے پہلی بار زندگی میں اپنے باپ کے پاس اتنا پیسہ دیکھا تھا جس سے وہ انہیں وہ سب کچھ لے کر دے سکتا تھا جو پہلے ان کے لیے خواب اور حسرت تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جیسے معجزاتی طور پر ان کی زندگی بدلی تھی' اور اس معجزے کا سہرا کوئی بھی چنی کے سر نہیں باندھ سکتا تھا۔ چنی اب ڈیڑھ سال کی ہو گئی تھی اور ایک بار پھر نہلانے دھلانے اور صاف کپڑوں کے ساتھ ساتھ وقت پر کھانے اور زندگی کی بنیادی ضروریات کے لیے ترسنا شروع ہو گئی تھی۔ مگر چنی کی صحیح خوش قسمتی کا آغاز اس دن ہوا تھا جب چنی کے خاندان کے ساتھ ہونے والے حادثے کے تقریباً" چھ مہینے کے بعد اس اسکول کا مالک چنی کو دیکھنے آیا تھا جہاں غلام فرید کام کرتا رہا تھا اور جہاں سے ایک سزا کے طور پر نکالے جانے نے چنی سے اس کا خاندان چھین لیا تھا۔

☆ ☆ ☆
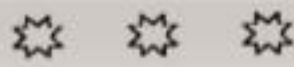
"تم سب آدم اور حوا کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ کسی عرب کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر' کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی برتری حاصل نہیں۔ برتری اگر ہے تو صرف تقویٰ کو۔

اور اپنے غلاموں کا خیال رکھو اور جو تم کھاؤ اس میں سے ان کو کھلاؤ اور جو تم پہنو اسی میں سے ان کو پہناؤ اور اگر وہ ایسی خطا کریں' جو تم معاف نہ کرنا چاہو تو انہیں فروخت کر دو لیکن کوئی سزا نہ دو۔

☆ ☆ ☆

بیرونی گیٹ ہمیشہ کی طرح گھر میں کام کرنے والی میڈ نے کھولا تھا۔ ڈرائیو وے پر گاڑی کھڑی کرتے ہوئے سالار نے ابھی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ ہی کھولا تھا جب ہر روز کی طرح لان میں کھیلتے اس کے دونوں بچے بھاگتے ہوئے اس کے پاس آ گئے تھے۔ چار سالہ جبریل پہلے پہنچا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اس نے اپنے بیٹے کا چہرہ چوما تھا۔ وہ پسینے سے شرابور تھا۔

"السلام علیکم!" گاڑی میں پڑے ٹشو باکس سے ٹشو نکال کر اس نے جبریل کا ماتھا اور چہرہ صاف کیا۔ جو اس نے بڑی فرماں برداری سے کروایا تھا۔ دو سالہ عنایہ تب تک ہانپتی کانپتی' شور مچاتی گرتی پڑتی اس کے پاس آ گئی تھی۔ دور سے پہلے اس کے بازوؤں کو دیکھ کر وہ کچھ اور کھلکھلائی تھی۔

اس نے ہمیشہ کی طرح اسے گود میں لیا تھا بہت زور سے اسے بھینچنے کے بعد اس نے باری باری بیٹی کے دونوں گال چومے تھے۔ جبریل تب تک ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ بند کر چکا تھا۔

اس نے عنایہ کو نیچے اتار دیا۔ وہ دونوں باپ سے ملنے کے بعد دوبارہ لان میں بھاگ گئے تھے جہاں وہ میڈ کی دو

بیٹیوں کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھے۔ وہ چند لمحے ڈرائیو وے پر کھڑا اپنے بچوں کو دیکھتا رہا۔ پھر گاڑی کے پچھلے حصے سے اپنا بریف کیس اور جیکٹ نکالتے ہوئے وہ گھر کے اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

امامہ تب تک اس کے استقبال کے لیے دروازے تک آچکی تھی۔ دونوں کی نظریں ملی تھیں۔ وہ حیرانی سے اس کے پاس آتے ہوئے مسکرائی۔

"تم جلدی آگئے آج؟"

اس نے ہمیشہ کی طرح اسے گلے لگاتے ہوئے اس کے بالوں کو ہولے سے سہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں آج زیادہ کام نہیں تھا۔"

"تو ڈھونڈ لیتے۔" وہ جواباً" اس کے ہاتھ سے جیکٹ لیتے ہوئے ہنسی' وہ جواب دینے کے بجائے مسکرا دیا۔

اپنے بیڈ روم میں بیٹھے اس نے جب تک اپنا بریف کیس رکھا اور جوتے اتارے' وہ اس کے لیے پانی لے آئی تھی۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟" وہ اس کے ہاتھ میں پکڑی ٹرے سے گلاس اٹھا رہا تھا جب امامہ نے اچانک پوچھا تھا۔ اس نے چونک اس کی شکل دیکھی۔

"ہاں بالکل۔ کیوں؟"

"نہیں' مجھے تھکے ہوئے لگے ہو' اس لیے پوچھ رہی ہوں۔" سالار نے جواب دینے کے بجائے گلاس منہ سے لگا لیا۔ وہ ٹرے لے کر چلی گئی۔

کپڑے تبدیل کر کے وہ سٹنگ ایریا میں آگیا تھا۔ لان میں اس کے دونوں بچے ابھی بھی اس فٹبال کے پیچھے بھاگتے پھر رہے تھے۔ وہ سٹنگ ایریا کی کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ کانگو کا موسم اسے کبھی پسند نہیں رہا تھا اور اس کی وجہ وہ بارش تھی جو کسی وقت بھی شروع ہو سکتی تھی اور جو شاید ابھی کچھ دیر میں پھر شروع ہونے والی تھی۔ کنشاسا میں پچھلے کئی دن سے ہر روز اسی وقت بارش ہوتی تھی۔ سہ پہر کے آخری چند گھنٹے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ کی بارش اور اس کے بعد مطلع صاف۔

"چائے۔" وہ امامہ کی آواز پر باہر لان میں دیکھتے بے اختیار پلٹا۔ وہ ایک ٹرے میں چائے کے دو مگ اور ایک پلیٹ میں چند بسکٹ لیے کھڑی تھی۔

"تھینکس۔" وہ مگ اور ایک بسکٹ اٹھاتے ہوئے مسکرایا۔

"باہر چلتے ہیں بچوں کے پاس۔" وہ باہر جاتے ہوئے بولی۔

"میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں' کسی کال کا انتظار کر رہا ہوں۔"

وہ سر ہلاتے ہوئے باہر چلی گئی' چند منٹوں کے بعد اس نے امامہ کو لان میں نمودار ہوتے دیکھا تھا۔ لان کے ایک کونے میں پڑی کرسی پر بیٹھتے وہ کھڑکی میں اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ وہ بھی جواباً" مسکرا دیا تھا۔

چائے کا مگ اور بسکٹوں کی پلیٹ اب لان میں اس کے سامنے پڑی ٹیبل پر رکھی تھی۔ اس نے باری باری جبریل اور عنایہ کو اس کے پاس آکر بسکٹ لیتے دیکھا۔ جبریل نے بسکٹ لے جا کر نو نو اور لویا کو دیے تھے' چاروں بچے ایک بار پھر سے فٹ بال کھیلنے لگے تھے امامہ اب مکمل طور پر بچوں کی طرف متوجہ تھی۔ چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے دائیں کندھے پر پڑی شال سے اپنے جسم کا وہ حصہ چھپائے جہاں ایک نئی زندگی پرورش پا رہی تھی (ان کے ہاں تیسرے بچے کی آمد متوقع تھی) وہ فٹ بال کے پیچھے بھاگتے بچوں کو دیکھتے ہوئے وقتاً" فوقتاً" ہنس رہی تھی اور پھر انہیں ہدایات دینے لگتی۔

سٹنگ ایریا کی کھڑکی کے سامنے کھڑے باہر دیکھتے ہوئے وہ جیسے ایک فلم دیکھ رہا تھا ایک مکمل فلم۔ اس کے

ہاتھ میں پکڑی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی' ایک گہرا سانس لے کر اس نے مگ پاس پڑی ٹیبل پر رکھ دیا۔
امامہ کا اندازہ "ٹھیک" تھا۔ وہ "ٹھیک" نہیں تھا۔ وہ کھڑکی کے شیشے سے باہر لان میں نظر آنے والی ایک خوش حال فیملی کو دیکھ رہا تھا۔ آئیڈیل پرفیکٹ لائف کا ایک منظر' اس کے بچوں کے بچپن کے قیمتی لمحے۔ اپنے اندر ایک اور ننھا وجود لیے اس کی بیوی کا مطمئن و مسرور چہرہ۔
چند پیپرز کو پھاڑ کر پھینک دینے سے یہ زندگی ایسے ہی خوب صورت رہ سکتی تھی۔
وہ ایک لمحہ کے لیے بری طرح کمزور پڑا۔ اولاد اور بیوی واقعی انسان کی آزمائش ہوتے ہیں ان کے لیے جنہیں "مال" آزمانے سے قاصر رہتا ہے' انہیں دیکھتے ہوئے وہ بھی اسی آزمائش کا شکار ہو رہا تھا ایک مرد' ایک شوہر ایک باپ کے طور پر لان میں موجود اس کی فیملی اس کی ذمہ داری تھی۔ وہ ان سے "خون" اور "محبت" کے رشتوں سے بندھا ہوا تھا۔
ایک لمحہ کے لیے اس کی نظر بھٹک کر جبریل اور عنایہ کے ساتھ کھیلنے والی چار اور چھ سال کی ان دو سیاہ فام لاغر بچیوں پر گئی تھی۔ اس کے خوب صورت گورے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے وہ اور بھی زیادہ بدصورت لگ رہی تھیں۔ ہیڈی کی وہ دونوں بیٹیاں اگر اس وقت مناسب لباس اور جوتوں میں ملبوس تھیں تو اس کی وجہ ہیڈی کا ان کے گھر کام کرنا تھا۔ ورنہ وہ گومبے کے بدحالی کے شکار ہزاروں بچوں کی طرح اپنا بچپن کسی آسائش کے بغیر محنت مشقت کرکے گزار رہی ہوتیں۔ اور ان کے وہاں سے چلے جانے کے بعد ان کا مستقبل پھر کسی بے یقینی کا شکار ہو جاتا' بالکل اسی طرح جس طرح اس مغربی نو آبادی کے وہاں آجانے سے پورا افریقہ بے یقینی اور عدم استحکام کا شکار ہو رہا تھا۔ وہ اسی مغربی نو آبادیات کے ایک نمائندے کے طور پر وہاں موجود تھا۔
اس نے اپنی تیس سالہ ملازمہ کو ڈرائیو وے پر کھڑے اپنی بچیوں کے کسی شاٹ پر تالیاں بجاتے دیکھا بالکل ویسے ہی جیسے لان کے ایک کونے میں کرسی پر بیٹھی اس کی بیوی اپنے دونوں بچوں کو کھیلتے دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ ہیڈی نے خود کبھی "بچپن" نہیں دیکھا تھا' وہ پیدا ہونے کے فوراً بعد "بالغ" ہو گئی تھی۔ افریقہ کے نوے فی صد بچوں کی طرح جنہیں "بچپن" یا "بقائے زندگی" میں سے کوئی ایک چیز ہی مل سکتی تھی۔
بچپن بہرحال ان آپشن میں سے تھا جو پریمیم کی لسٹ میں آتے تھے اور ایسا ہی ایک option اپنے بچوں کو دینے کے لیے ہیڈی سنگل پیرنٹ کے طور پر جان توڑ محنت کر رہی تھی۔ وہ ان کے ساتھ "انسانیت" کے رشتے میں منسلک تھا۔
ایک لمبے عرصہ کے بعد وہ پہلی بار وہاں کھڑا اپنی اولاد کا اس عورت کی اولاد سے موازنہ کر رہا تھا۔ اپنی بیوی کی زندگی اور اس عورت کی زندگی کا مقابلہ کر رہا تھا حالانکہ وہ آج وہاں اس کام کے لیے نہیں کھڑا تھا۔
اس کا فون بجنے لگا تھا۔ ایک گہرا سانس لے کر اس نے فون کرنے والے کی آئی ڈی دیکھی۔ کال ریسیو کرتے ہوئے اسے اندازہ تھا اس وقت دوسری طرف وہ کس سے بات کرنے والا تھا اسے اپنی فیملی کی زندگی اور استعفے میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا تھا۔

☆ ☆ ☆
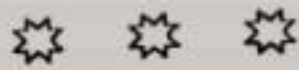
"خوب سن لو۔ اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔ پانچ وقت کی نماز قائم کرو۔ رمضان کے روزے رکھو۔ اپنے مال کی زکوٰۃ خوشی سے ادا کرو۔ اپنے حاکم کی اطاعت کرو۔ چاہے وہ ایک ناک کٹا حبشی ہی کیوں نہ ہو..... اور اس طرح اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ۔"

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)